پُرخوف قلعہ
اِشتیاق احم

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ:

مخلص:
اشتیاق احمد

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستان کا
وہ گُل ہوں مَیں، خزاں ہر گُل کی ہے گویا خزاں میری

مجھے رازِ دو عالم دِل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

اقبالؔ

بے محابانہ ، لیکن کارنامے انجام دیتا ہے مخالفانہ

وضاحت :

یہ ایسے لوگوں کے بارے میں کہا گیا جو اسلام کے دعوے کرتے ہیں لیکن اسلام کی جڑیں کاٹنے میں لگے رہتے ہیں ——

✣

دو باتیں

✦✦✦✦✦✦✦✦

السلام علیکم ـــ

اس بار ایک پنتھ کئی کاج ہو رہے ہیں — ایک خاص نمبر کی بجائے آپ تین خاص نمبر ہاتھوں میں لیے بیٹھے ہیں اور پھولے نہیں سما رہے ہیں — اس کے ساتھ ساتھ عید کی خوشیوں نے آپ کو گھیرے میں لیا ہوا ہے ، ہو سکتا ہے آپ لوگ اس الجھن میں بھی ہوں کہ پہلے عید سے نمٹیں یا خاص نمبروں کو چٹ کریں — کچھ کا خیال ہوگا ، اگر خاص نمبر چٹ کرنے بیٹھے تو سوئیاں دوسرے اڑا جائیں گے — اور اگر سوئیاں ہضم کرنے کے چکر میں پڑے تو کہیں خاص نمبر ہاتھ سے نکل کر بھائی جانوں اور باجی جانوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں ، گویا یہ ایک پنتھ اور کئی کاج کافی الجھا ہوا محسوس ہوا ، بلکہ ٹیڑھی لکیریں لگ رہا ہے ، لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں — اگر عید کی تاریخ اور خاص نمبروں کی تاریخ ایک ساتھ آگئی تو میں کیا کر سکتا ہوں — ارے — ایک کاج کو تو بھول ہی گیا — یکر اس ز خاص نمبر نہ خریدنے کے سلسلے میں آپ کو کچھ مشکلات

کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ بھئی جیبیں تو گرم ہو ہی
چکی ہوں گی۔ لیجیے ایک کاج اور نکل آیا۔ عید کے
موقعوں پر عید کا تحفہ دینا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا
میرے نزدیک تو اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ آپ خاص نمبرز
کا تحفہ اپنے دوستوں کو دے سکتے ہیں، لیکن ان سے
پوچھ کر۔ ایسا نہ ہو، وہ بھی آپ کے لیے خاص نمبرز کا تحفہ
ہی لیے چلے آ رہے ہوں اور اس طرح خاص نمبر سے
خاص نمبر ٹکرا جائیں، حالانکہ میں نے انہیں اس بار
بالکل الگ لکھا ہے اور ایک پارٹی کو دوسری پارٹیوں
سے کوسوں دور رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ آپ
پڑھنے کے بعد دیکھ ہی لیں گے کہ اس کوشش
میں میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں —
ایک ہفتہ میں اب تک کتنے ہی کاج چل گئے
ہیں اور اگر میں نے دو باتیں جاری رکھیں تو
ان کا سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا اور آپ ان کی رو میں بہتے
چلے جائیں گے اور ناول کی رو میں بہنا یکسر بھول جائیں
گے، جب کہ میں ایسا نہیں چاہتا — میں تو چاہتا ہوں،
آپ ناول کے دھارے میں بہیں — اور اس طرح بہیں کہ
ہوش و حواس گم نہ کر بیٹھیں، کیونکہ ابھی آپ کو سوال

کا جواب بھی دینا ہے اور دو ہزار میں سے اپنا حصہ وصول کرنے
کی سر توڑ کوشش بھی تو کرنا ہے — لہٰذا اگر میں یہ کہوں کہ
دو باتیں کا دفتر بند — تو بُرا نہ مان جائیے گا — یوں بھی
ابھی مجھے دو اور خاص نمبروں کی دو باتیں لکھنا ہیں۔ جب
تینوں خاص نمبروں کی دو دو باتیں جمع کریں گے تو ایک
لحاظ سے تو وہ چھ باتیں بن جائیں گی، لیکن دوسرے بلکہ
تیسرے لحاظ سے وُہ پرانی شیطان کی آنت والی دو باتیں
ہی کہلائیں گی اور میرا خیال ہے، شیطان کی آنت اور آپ
کا چولی دامن کا ساتھ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا، ہاں خدا واسطے
کا بیر ضرور ہو سکتا ہے — لہٰذا خدا حافظ — ارے ہاں —
آپ سب کو عید مُبارک — چلتے چلتے ایک بات اور — اپنے
آس پاس دیکھ لیجیے گا — کہیں کوئی غریب عید کی
خوشیوں سے محروم تو نہیں —

ترتیب

****

پُراسرار کارڈ
لائٹر + ماچس
بریف کیس کی موت
خون کا بازار
وہ کون ہے
محاورات کا قتل
میں یہ گیا
تیسری کڑی
فرضی فون
خوف کا وہم
کس کا منصوبہ
نہیں !!!
موت بھی کیا چیز ہے
آؤ بھی چلیں

پُراسرار کارڈ

انسپکٹر جمشید کی آنکھ کھلی تو گھڑی ٹھیک ایک بجا رہی تھی۔ انھوں نے ذہن پر زور دیا، لیکن آنکھ کھلنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی، بائیں طرف دیکھا، بیگم جمشید گہری نیند میں غرق نظر آئیں، کمرے کا دروازہ بند تھا، کھڑکی بھی بند تھی — کسی قسم کی کوئی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی، اس کے باوجود ان کی چھٹی حس انھیں خبردار کیے دے رہی تھی اور بار بار ان سے کہہ رہی تھی — کوئی بات ضرور ہے —

آخر وہ بستر سے اُٹھے، دبے پاؤں دروازے پر پہنچے اور پھر آواز پیدا کیے بغیر چٹخنی گرا دی، یک دم دروازہ کھولا اور صحن میں آ گئے — صحن میں بھی کوئی عجیب بات نظر نہ آئی — اب انھوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کے کمرے کا رُخ کیا، ان کا دروازہ بھی بند تھا — کان لگا کر سننے کی کوشش کی، لیکن اندر سے کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی — اب وہ چھت پر پہنچے —

چھت پر بھی کوئی گڑبڑ نظر نہیں آئی۔ چاروں طرف نیچے جھانک کر دیکھا اور پھر بڑبڑاتے ہوئے زینے کا رُخ کیا:

"شاید میری آنکھ بلا وجہ ہی کُھل گئی تھی۔"

اپنے کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ بیرونی دروازے کو تو دیکھ ہی نہیں سکے تھے۔ تیزی سے پھر باہر نکلے۔ دروازہ اندر سے بند تھا، اسے کھولا، باہر نکلے، چاروں طرف ایک چکر لگایا اور پھر محمود، فاروق اور فرزانہ کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آئے۔

ہر طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد وُہ اندر آئے اور کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئے، لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دُور جا چکی تھی:

"آج کیا ہو گیا ہے مجھے۔" یہ کہتے وقت وہ پھر بستر سے اُٹھ بیٹھے، جب کچھ نہ سوچا تو بیگم جمشید کو جگایا۔

"پتا نہیں کیا بات ہے، میں ایک انجانا سا خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ پورے گھر کو دیکھ چکا ہوں، باہر کا بھی ایک چکر لگا آیا ہوں، لیکن کہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ اس کے باوجود نیند پھر بھی نہیں آ رہی۔"

"تب پھر آپ کو چاہیے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو جگا دیں۔" بیگم جمشید نے تجویز پیش کی۔

"اوہ ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" انھوں نے کہا۔

دونوں جلدی سے ان کے کمرے کے سامنے پہنچے، ابھی دستک دینے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور محمود، فاروق اور فرزانہ کی صورتیں دکھائی دیں۔ ان کے چہرے دُھواں ہو رہے تھے۔

"تو تم بھی خطرہ محسوس کر رہے ہو؟"

"جی۔ جی ہاں۔" محمود بوکھلا اٹھا۔

"تب پھر ہمارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ فوراً گھر سے نکل جائیں، آؤ جلدی کرو۔"

انھوں نے باہر نکلنے میں ذرا دیر نہ لگائی اور بیگم شیرازی کے گھر کے دروازے پر جا کر رُکے۔ محمود نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ تیسری گھنٹی پر کہیں جا کر اندر روشنی نظر آئی اور پھر دروازہ کھلا:

"خیر تو ہے۔" بیگم شیرازی کی حیرت زدہ آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہم اپنے گھر میں ایک انجانا سا خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ اس لیے یہاں آ گئے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ۔ آئیے۔" انھوں نے راستہ دیا۔

اندر آ کر انسپکٹر جمشید نے سب سے پہلے چند ماہرین کو فون کیا، پھر خان رحمان کے نمبر ڈائل کیے۔ کافی دیر تک گھنٹی بجتی

رہی، آخر خان رحمان کی جھنجلائی ہوئی آواز کانوں میں گونج اٹھی:

"آپ جو کوئی بھی ہیں، پہلے یہ سن لیں کہ رات اللہ تعالیٰ نے آرام کے لیے بنائی ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ارے! یہ تم ہو جمشید، تمھارے لیے تو میں اپنی زندگی کی سیکڑوں راتیں جاگ کر کاٹ سکتا ہوں۔"

"تو پھر جلدی چلے آؤ، لیکن اس وقت ہم بیگم شیرازی کے گھر میں ہیں۔"

"کیا مطلب — تمھارے اپنے گھر کو کیا ہوا؟" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا، لیکن شاید کچھ ہونے والا ہے۔"

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے مکان کو بخار ہونے والا ہو۔" خان رحمان فکر مندانہ لہجے میں بولے۔

"بھئی آ جاؤ، باتیں تو ہم بعد میں بھی کر لیں گے۔"

"اچھی بات ہے — بیس منٹ کے اندر اندر پہنچ رہا ہوں — ان شاء اللہ۔" یہ کہتے ہی انھوں نے ریسیور رکھ دیا — اب انسپکٹر جمشید نے پروفیسر داؤد کے نمبر ڈائل کیے — انھوں نے جاگنے میں زیادہ دیر نہ لگائی:

"ہیلو پروفیسر صاحب — آپ کو تکلیف دے رہا ہوں — مہربانی

فرما کر فوراً چلے آئیے۔"

"تکلیف کیسی جمشید — تم رات کے ایک بجے بھی بلاؤ تو میں فو[راً] آؤں گا۔"

"تو پھر اس وقت بھی ایک ہی بج رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے —

"ارے نہیں — ابھی تو سوا گیارہ بجے ہیں۔"

"سوا گیارہ بجے ہیں — یہ کیا — کہیں آپ کی گھڑی تو خراب نہیں —"

"ایک گھڑی تو خیر خراب ہو سکتی ہے، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر میں جتنی گھڑیاں ہوں خراب ہو جائیں۔"

"اوہ!" انسپکٹر جمشید اچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں، کیونکہ ان کے ہاتھ کی گھڑی اس وقت سوا بجا رہی تھی — جب کہ پروفیسر داؤد سوا گیارہ بجے کا وقت بتا رہے تھے — آخر انھوں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"ہو سکتا ہے، میری گھڑی خراب ہو گئی ہو — اب آپ نہ آئیں — اور تجربہ گاہ کے دروازے بند کر لیں — میں آ رہا ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی — ابھی تو مجھے بلا رہے تھے اور اب کہہ رہے ہو، میں نہ آؤں۔"

"جی ہاں! یہی مناسب ہے — آپ نہ آئیں، میں آتا ہوں —"

دروازے فوراً بند کرلیں۔" یہ کہتے ہی انھوں نے سلسلہ کاٹ دیا
اور خان رحمان کے نمبر ڈائل کیے — دوسری طرف سے فوراً ہی
ان کی آواز سُنائی دی:

"ہیلو — خان رحمان بول رہا ہوں، اس وقت میں بہت
جلدی میں ہوں، کسی کی کوئی بات نہیں سُن سکتا — آپ جو کوئی
بھی ہیں — تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جمشید کے نمبر پر مجھ سے
بات —"

"اور میں انسپکٹر جمشید ہی ہوں خان رحمان — پہلے میری ایک
بات کا جواب دو۔"

"اوہ جمشید — بھئی معاف کرنا۔ میں لباس تبدیل کر رہا تھا۔
ظاہر ہے، لباس تبدیل کیے بغیر نہیں آسکتا تھا۔"

"ہوں — کوئی بات نہیں — ذرا یہ تو بتاؤ — وقت کیا ہوا ہے؟"

"تم ایک بات پوچھنے کی بات کر رہے تھے۔" خان رحمان نے
گویا یاد دلایا۔

"وہ بات وقت پوچھنے کی ہی تھی — جلدی وقت بتاؤ۔"

"کیوں کیوں — تمھاری گھڑی کو کیا ہوا اور پھر تمھارے گھر
میں صرف ایک ہی گھڑی تو نہیں ہے۔"

"اوہو — خان رحمان — یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔"

"تو کیا وقت بتانے کا وقت ہے۔" وہ ہنسے۔

"کہیں آج تم میں فاروق کی رُوح تو نہیں حلول کر گئی۔ خدا
کے لیے جلدی وقت بتائیے۔"

"گیارہ بج کر سترہ منٹ ہو چکے ہیں۔"

"اُف خدا — اب تم نہ آنا — میں محمود، فاروق اور فرزانہ کو
تمھاری طرف بھیج رہا ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"پتا نہیں — کیا بات ہوئی — بات کے ہونے اور نہ ہونے پر
بعد میں بات کرلیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے تیزی سے کہا اور ریسیور
پٹخ دیا:

"بیگم — تم بھابی کے ساتھ رہو گی — دروازے اندر سے بند
کرلو — محمود، فاروق اور فرزانہ — تم اپنے انکل خان رحمان کے
پاس پہنچ جاؤ اور میں پروفیسر داؤد کی طرف جا رہا ہوں۔"

"لیکن ابا جان — ہمیں تو دُور دُور تک کوئی خطرہ نظر نہیں آ
رہا —"

"تب تم جاگ کیوں گئے تھے؟"

"اس کی وجہ ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اور تمھاری گھڑیاں کیا وقت بتا رہی ہیں؟"

"ایک بج کر بیس منٹ۔" انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

"اور تم سُن ہی چکے ہو — پروفیسر داؤد صاحب کی گھڑی اُدھر

تمھارے انکل خان رحمان کی گھڑی سے آخر ہماری گھڑیاں دو گھنٹے
آگے کیوں ہیں۔ یہ کیا بات ہے اور یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"ہوں۔ بات عجیب ہے۔ اور عجیب سے کہیں زیادہ غریب —
اس لیے ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" فاروق نے گھبرائی ہوئی
آواز میں کہا۔

"ہاں ہم پہلے ہی بہت دیر کر چکے ہیں۔"

"اور ایک ضروری ہدایت یہ ہے کہ عام راستے سے نہ جانا —
یعنی جس راستے سے ہم عام طور پر پروفیسر صاحب اور خان رحمان
کے گھر جاتے ہیں، اس وقت اس راستے سے نہ جانا۔"

"جی۔ وُہ کیوں، اس کی کیا ضرورت —"

"بھئی وضاحت بعد میں۔" یہ کہہ کر انھوں نے باہر کی طرف دوڑ
لگا دی۔ جلدی سے اپنی جیپ میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

انھوں نے بھی پروفیسر صاحب کی تجربہ گاہ تک جانے کے لیے
ایک اور راستہ اختیار کیا اور بلا کی رفتار سے چلتے ہوئے تجربہ گاہ
پہنچے۔ ان کی آواز سنتے ہی پروفیسر صاحب نے دروازہ کھول دیا۔
ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں:

"آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں جمشید! بالکل ٹھیک ہوں۔ یہاں تو دُور دُور تک کوئی خطرہ
نہیں ہے، کہیں تم کسی وہم کا شکار تو نہیں ہو گئے۔"

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں، آپ فوراً اپنا کوٹ مجھے دے
دیں اور ٹوپی بھی۔"

"کیوں۔ ان کا کیا ہو گا؟"

"بہت جلد بتا دوں گا۔ بس آپ جلدی کریں۔"

حیرت کے عالم میں انھوں نے کوٹ اور ٹوپی انھیں دے
دی۔ جلدی سے کوٹ پہن کر اور ٹوپی سر پر رکھ کر وہ باہر نکل آئے
اور پروفیسر داؤد کی سفید کار میں بیٹھتے ہوئے بولے:

"آپ اسی طرح دروازے بند کر کے بیٹھے رہیں اور کسی کے
لیے بھی دروازہ نہ کھولیں، جب تک کہ میری دستک کی آواز کو
نہ پہچان لیں اور میری آواز نہ سُن لیں۔"

"اچھی بات ہے۔ تم تو مجھے ڈرائے دے رہے ہو۔"

"فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر انھوں نے کار سٹارٹ کر دی اور پھر
اسی راستے پر چل پڑے جس سے عام طور پر تجربہ گاہ تک آنا
جانا تھا۔ چند منٹ بعد ہی انھیں کار کے پیچھے ایک اور گاڑی کی
روشنیاں نظر آئیں، ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی —
پیچھے سے آنے والی گاڑی اندھا دھند آ رہی تھی۔ انھوں نے
اسے راستہ دے دیا اور اپنی کار کو سڑک سے نیچے اتارتے چلے
گئے۔ یہی نہیں — خود کو بالکل نیچے جھکا لیا۔ ایک کار زن
کرکے ان کے پاس سے گزر گئی، لیکن اس سے کوئی فائر نہیں

کیا گیا —

اب وُہ پھر کار کو سڑک پر لے آئے ۔ اگلی کار کی رفتار کم ہوتے ہوتے رُک گئی ۔ یہ دیکھ کر وُہ بڑ بڑائے :

" تو میرا اندازہ درست تھا ۔"

انھوں نے بھی اپنی کار روک لی ۔ دم سادھے کار میں بیٹھے رہے ۔ عین اسی وقت انھوں نے محسوس کیا ۔ ان کے پیچھے ایک اور کار تیز رفتاری سے آ رہی ہے ۔ اب وُہ سمجھے ۔ اگلی کار والے کس انتظار میں تھے ۔ اب کار میں بیٹھے رہنا خطرناک تھا، انھوں نے آواز پیدا کیے بغیر بائیں طرف کا دروازہ تھوڑا سا کھولا اور بیٹھے بیٹھے کار سے اُتر آئے ۔ کھڑے ہوئے بغیر وُہ جنگل کی طرف رینگ گئے ۔ دوسرے ہی لمحے وُہ ایک درخت کی اوٹ لے چکے تھے اور ان کے ہاتھ میں ریوالور تھا ۔ اسی وقت پروفیسر داؤد کی کار پر دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی ۔ گولیاں برسانے کا یہ سلسلہ تین سیکنڈ تک جاری رہا ۔ اور پھر پستول خاموش ہو گئے —

دونوں گاڑیوں سے چار چار آدمی پروفیسر داؤد کی کار تک پہنچے ۔ اندر جھانک کر دیکھا اور پھر ان میں سے ایک نے گھبرا کر کہا :

" اس ۔ اس میں تو کوئی بھی نہیں ۔ پروفیسر داؤد کہاں چلا گیا ؟"

" وُہ ضرور جنگل میں گھس گیا ہے ۔ افسوس ۔ یہ کیا ہوا ۔"

" پروا نہ کرو ۔ ہمارے پاس ٹارچیں موجود ہیں ۔ ہم ابھی اسے تلاش کر لیتے ہیں ۔" دُوسرا بولا ۔

وُہ جنگل کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک فائر ہوا ، ان میں سے ایک کے منہ سے دل دوز چیخ نکلی ۔ باقی آناً فاناً لیٹ گئے اور اندھا دھند جنگل کی طرف گولیاں برسانے لگے ۔ انسپکٹر جمشید نیم دائرے کی صورت میں رینگتے سڑک پر آ گئے اور ان کے عقب میں پہنچ کر پھر فائرنگ شروع کر دی ۔ ان میں سے کئی ایک کی چیخیں بلند ہوئیں اور پھر تو ان میں بھگدڑ مچ گئی ۔ انسپکٹر جمشید پچھلی کار کے نزدیک تھے ، اس لیے ان میں سے کوئی اس طرف رخ نہ کر سکا ۔ ان میں سے جو اگلی کار میں سوار ہو سکے ، ہوئے اور بھاگ نکلے ۔ انسپکٹر جمشید نے ان کے پیچھے رہ جانے والی کار میں بیٹھ کر لائٹیں روشن کیں — روشنی میں انھیں چار آدمی زخمی حالت میں نظر آئے ۔ ان میں تین کی حالت نازک تھی ، ایک کی صرف ایک ٹانگ زخمی نظر آئی —

کار سے باہر نکل کر وہ ان کی طرف بڑھے ، لیکن اسی وقت ان تینوں نے دم توڑ دیا ۔ انھوں نے زخمی ٹانگ والے کو اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈالا ۔ باقیوں کی جیبوں کی تلاشی

جلدی جلدی لی اور جو کچھ برآمد ہوا، اس کا جائزہ لیے بغیر جیب میں ٹھونسا اور کار میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسے ہسپتال میں داخل کرانے کے بعد وہ پھر پروفیسر داؤد کے ہاں پہنچے۔

"ارے! میری کار کیا ہوئی؟"

"اس میں تو نہ جانے کتنے سوراخ ہو گئے ہیں اور ٹائر بھی بے کار ہو چکے ہیں، اگر میری بجائے اس میں آپ بیٹھ کر جاتے، ان گولیوں کا نشانہ آپ بنتے۔"

"نہیں!!!" پروفیسر داؤد دھک سے رہ گئے۔

"آئیے چلیں، آپ کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔" وہ بولے۔

پروفیسر داؤد اور شائستہ کو لے کر وہ خان رحمان کے گھر آئے۔ یہاں حالات پُرسکون تھے۔ انھوں نے پہلے تو اکرام کو فون کیا، اسے جنگل میں پڑی تین لاشوں اور بے کار ہو جانے والی پروفیسر داؤد کی کار کے بارے میں ہدایات دیں اور پھر ریسیور رکھ کر ان کی طرف مڑے۔ مختصر طور پر حالات انھیں سنائے، وہ سُن کر سکتے میں آ گئے۔

"سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ہماری گھڑیوں پر وقت کس طرح غلط ہو گیا۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"اس پر تو شاید پروفیسر داؤد روشنی ڈال سکتے ہیں۔" انسپکٹر

جمشید ان کی طرف مڑے۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ یہ کام ایک طاقت ور مقناطیس کی سی کسی چیز سے لیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے وہ لوگ کم از کم تمھارے کمروں کے روشندانوں تک ضرور آئے ہوں گے۔ روشن دانوں کے ذریعے انھوں نے کسی سلاخ کے سرے پر مقناطیس کی سی کوئی چیز لگا کر کمرے میں گزاری ہو گی اور گھڑیوں کے شیشوں پر رکھ کر سوئیوں کو دو گھنٹے آگے کر دیا ہو گا۔ اس میں عجیب بات کیا ہے۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ انھیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" محمود بولا۔

"مجھے خطرے کا شدید احساس دلانا۔ شاید اسی سلاخ کے ذریعے مجھے جگایا گیا ہو گا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اور وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ خطرے کو بھانپ کر آپ پروفیسر انکل کو بلائیں۔ اور گھر سے نکلتے ہی وہ انھیں گولیوں کا نشانہ بنا دیں۔"

"یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے۔ ان کا پروگرام دراصل یہی تھا، اب سوال یہ ہے کہ ان کا یہ پروگرام کیوں تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک تو وہ زخمی موجود ہے اور دوسرے ان لوگوں کی جیبوں سے نکلی ہوئی چیزیں، پہلے ان چیزوں کا جائزہ لے

لیا جائے۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے اپنی جیب سے وہ سب چیزیں نکالیں اور میز پر ڈھیر کر دیں — سب ان پر جھک گئے۔

یہ سب عام استعمال کی چیزیں تھیں — سگریٹ، سگریٹ لائٹر، کرنسی نوٹ — ملاقاتی کارڈ وغیرہ — ابھی وہ ان چیزوں کو دیکھ ہی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی — ساتھ ہی فرزانہ کے منہ سے نکلا:

"ارے! میں تو اس کارڈ کو ملاقاتی کارڈ خیال کر رہی تھی۔"

"تو پھر — کیا یہ شناختی کارڈ ہے۔" فاروق حیران ہو کر بولا۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔" انسپکٹر جمشید کی لرزتی آواز نے انھیں ساکت کر دیا — ان کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی:

"اُف خدا — کیا واقعی یہ ہو چکا ہے — ہوں — تو پھر بیگم — تم ایسا کرو کہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر یہاں آ جاؤ۔" یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے:

"ہمارا گھر ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا ہے — یہی وہ چیز تھی — جس نے مجھے جاگنے پر مجبور کر دیا تھا — انھوں نے ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ کوئی ٹائم بم لگا دیا تھا۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"خیر کوئی بات نہیں، شکر الحمد اللہ کہ ہم سب بال بال بچ

گئے — ورنہ میں نے تو تمھارے پروفیسر انکل اور خان رحمان کو بھی اپنے گھر بلا لیا تھا — دشمنوں کا پروگرام دراصل یہ تھا کہ تینوں گھرانوں کو مکمل طور پر تہس نہس کر دیا جائے۔"

"لل — لیکن — وہ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں — انھیں ہم سے کیا تکلیف پہنچی ہے۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا — شاید اسے اپنا گھر ملبے کا ڈھیر بن جانے کا افسوس تھا۔

"اب یہی دیکھنا ہے — فرزانہ تم کچھ کہہ رہی تھیں۔" انسپکٹر جمشید اس کی طرف مڑے۔

"ان کارڈوں کو دیکھیے — بالکل ملاقاتی کارڈوں جیسے ہیں، لیکن ان پر کسی کا نام نہیں لکھا — بس ایک نشان سا بنا ہوا ہے اور انگریزی کی چند حروف لکھے ہیں۔"

انسپکٹر جمشید نے ایک کارڈ لے کر دیکھا اور پھر اچھل پڑے، دوسرے ہی لمحے وہ دروازے کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔

"ارے ارے — خیر تو ہے ابا جان۔"

لائٹر + ماچس

محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان دوڑتے ہوئے باہر پہنچے تو انسپکٹر جمشید خان رحمان کی کار میں بیٹھ چکے تھے۔ انھیں نزدیک پہنچتے دیکھ کر بولے:

"چلو بھئی۔ آگئے ہو تو جلدی کرو۔"

وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب تک پروفیسر داؤد اور دوسرے باہر آئے، کار ہوا ہو چکی تھی۔

"اگر ہم فوراً باہر نہ نکلتے تو آپ جا چکے تھے۔"

"ہاں! رکنا مناسب نہیں تھا۔" وہ بولے۔

"ان کارڈوں میں کیا بات ہے؟"

"وہ کارڈ ایک خوفناک تنظیم کے ہیں۔ اس پر بنا ہوا سُرخ پنجہ۔ اور انگریزی کے حروف (MIP) ایم آئی پی کو میں بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں اور اگر اس مرتبہ ہمارا واسطہ اس تنظیم سے ہے تو پھر یہ بات واقعی حد درجے خطرناک ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" محمود بے چین ہو گیا۔

"ایم آئی پی دُنیا کے انتہائی خطرناک لوگوں کا ایک گروہ ہے، اس گروہ کے ہر فرد کے پاس اس قسم کا کارڈ ہوتا ہے، اس کارڈ کی مدد سے ان کا کوئی کارکن دُنیا کے کسی بھی ملک میں اس گروہ کے کسی آدمی سے مدد لے سکتا ہے، بس کارڈ دکھانے کی ضرورت ہے۔ پھر تم جو کہو گے۔ وہ کرے گا۔"

"لیکن اس طرح تو یہ کارڈ بہت کام کی چیز ہیں، کیونکہ اب یہ ہمارے ہاتھ بھی تو لگ چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب تو ہم بھی ان کے ذریعے کام لے سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ یہ اتنا آسان نہیں، کیونکہ صرف یہ کارڈ ہی کافی نہیں، اس کے ساتھ چند جملوں کا تبادلہ بھی کرنا پڑتا ہے، اگر ہم کارڈ دکھانے کے بعد وہ جملے نہ ادا کریں تو وہ جان جائیں گے۔ ہمارا تعلق اس تنظیم سے نہیں، کارڈ کسی طرح ہمارے ہاتھ لگ گئے ہیں، پھر ہو گا یہ کہ وہ پہلی فرصت میں ہمیں ہلاک کر دیں گے اور کارڈ حاصل کر لیں گے۔"

"اوہ۔ اور یہ تنظیم چاہتی کیا ہے؟"

"کس ملک میں یہ کیا چاہتی ہے۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔" وہ بولے۔

"لیکن جمشید۔ اب ہم کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟" خان رحمان

حیران ہو کر بولے۔

"ہسپتال۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ زخمی ایم آئی پی کا کارکن ہے تو میں ہرگز اسے ہسپتال میں داخل نہ کراتا۔ بلکہ سیدھا تمہارے گھر لے جاتا۔"

"کیوں۔ اسے ہسپتال میں داخل کرانے میں کیا حرج ہو گیا۔"

"ایم آئی پی کا ایک اصول ہے۔ جب ان کا کوئی آدمی کہیں پھنس جاتا ہے تو یا تو اسے چھڑا لیتے ہیں اور اگر چھڑا نہیں سکتے تو پھر موت کے گھاٹ ضرور اُتار دیتے ہیں۔"

"تو کیا کارڈ اس کی جیب سے بھی برآمد ہوا تھا؟"

"افسوس! میں نے اس کی جیب کی تلاشی نہیں لی تھی۔ صرف مرجانے والوں کی لی تھی۔" وہ بولے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ہم کسی گورکھ دھندے میں پھنسنے والے ہیں۔" فاروق نے سرد آہ بھری۔

"پھنسنے والے ہیں نہیں، بلکہ پھنس چکے ہیں۔" فرزانہ نے مُنہ بنایا۔

"خیر۔ ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا، ہم چاہیں تو اب بھی اس معاملے سے اپنے آپ کو الگ رکھ سکتے ہیں۔" فاروق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے۔ کیا تم بھول گئے۔ ہمارا گھر ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے۔ پروفیسر انکل کی کار کا حلیہ بدل گیا، ابا جان پر گولیوں کی بوچھاڑ

کر دی گئی۔ نتیجے میں تین دشمن ہلاک اور ایک زخمی ہوا۔ اس قدر آگے جانے کے بعد ہم اس معاملے سے الگ کس طرح ہو سکتے ہیں۔" محمود نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"ان سب باتوں کے باوجود میرا خیال ہے کہ ہم الگ ہو سکتے ہیں۔" فاروق نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"آخر تم الگ ہونے پر کیوں تُل گئے ہو اور اگر تُل ہی گئے ہو تو ہمیں کیوں تلنے پر مجبور کر رہے ہو۔" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

"میں تو آج تک وزن کرنے والی مشین پر نہیں تُلا۔" فاروق نے جل بھن کر جواب دیا۔

"بھئی میرا خیال ہے، ہم اس معاملے سے کسی صورت بھی الگ نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ پروفیسر صاحب کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا چکے ہیں، ان کا سُراغ لگانا ہی ہو گا۔ ورنہ پروفیسر صاحب ہر وقت خطرے میں گھرے رہیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے گویا فیصلہ دیا۔

اور اسی وقت وہ ہسپتال تک پہنچ گئے۔ انسپکٹر جمشید انتہائی تیز رفتاری سے آئے تھے۔ راستے میں کئی جگہ انھیں رکنے کا اشارہ بھی کیا گیا تھا، لیکن انھوں نے کوئی پروا نہ کی اور تعاقب میں آنے والے پولیس سارجنٹوں کو ہاتھ کے خاص اشارے سے بتا دیا کہ ان کا تعاقب کرنے کی ضرورت نہیں، دراصل وہ اس وقت خان رحمان کی کار میں سوار تھے، اگر جیپ میں ہوتے تو

ان کے تعاقب کی نوبت نہ آتی۔

کار سے اُتر کر وُہ جلدی جلدی اندر کی طرف بڑھے اور زخمی کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید ایک آدمی سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ دراصل وُہ بے چارہ دروازے کی طرف آ رہا تھا اور یہ اندر داخل ہو رہے تھے:

"ذرا دیکھ کر جناب:" اس نے گھبرا کر کہا۔

"اوہ۔ معاف کیجیے گا۔ لل۔ لیکن۔ آپ کون ہیں؟"

"راضی کا اُستاد۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ راضی کا اُستاد۔ یہ تو۔ یہ تو۔" فاروق ہکلا کر رہ گیا، کیونکہ اسی وقت انسپکٹر جمشید نے اسے تیز نظروں سے گھورا تھا، فاروق کہنا چاہتا تھا، یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔

"ہاں۔ راضی کا اُستاد۔ اور راضی کا ہی کیا۔ میں تو نہ جانے اور کتنوں کا اُستاد ہوں۔"

"ہونے کو تو آپ ریاضی کے اُستاد بھی ہو سکتے ہیں جناب۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ارے۔ اسے کیا ہوا؟" انسپکٹر جمشید بوکھلا اٹھے۔ ان کی نظریں بستر پر لیٹے اس زخمی پر جمی تھیں جو ساکت لیٹا ہوا تھا۔

"یہی پوچھنے میں ڈاکٹر صاحب کے پاس جا رہا تھا۔" راضی کے

استاد نے فوراً کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"جب سے آیا ہوں۔ اس نے ایک بات نہیں کی۔ آوازیں دے دے کر تھک گیا۔"

"تو یہ آپ کے عزیز ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"آپ لوگ شاید دوسروں کی باتیں دھیان سے سننے کے ذرا بھی عادی نہیں ہیں۔" اس نے تلملا کر کہا۔

"کیا مطلب۔ یہ بات آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں۔ اس کا اُستاد ہوں اور پھر بھی آپ پوچھ رہے ہیں۔ آپ اس کے عزیز ہیں۔" اس نے تنک کر کہا۔

"ارے۔ تو ان کا نام راضی ہے۔" فرزانہ چہکی۔

"ہاں! اب تو سمجھ گئے ہو گے۔" اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"جی۔ جی ہاں۔ بالکل۔ اس میں نہ سمجھنے والی کیا بات ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

انسپکٹر جمشید اس وقت تک زخمی کے بالکل قریب جا چکے تھے، استاد صاحب دروازے سے نکل رہے تھے کہ وہ پکار اٹھے:

"ایک منٹ جناب۔ ذرا ادھر دیکھیے۔"

وہ جلدی سے مڑا۔ اور انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

" جی فرمائیے — کیا بات ہے ۔"

" آپ ڈاکٹر کو بلانے جا رہے ہیں نا ۔"

" ہاں ! بالکل ، کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے ۔"

" لیکن اب ڈاکٹر کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔"

" کک ۔ کیا مطلب — کیا یہ ہوش میں آچکا ہے ؟"

" جی نہیں ، یہ ہمیشہ کے لیے بے ہوش ہو چکا ہے ۔"

" کیا — نہیں !!" وہ چیخ اٹھا اور تیزی سے راضی کے بستر کی طرف جھپٹا — پھر اس کے سینے پر کان رکھ دیے —

" یہ جا چکا ہے — اب اس میں کچھ باقی نہیں ، آپ کو کیا سنائی دے گا ۔" انسپکٹر جمشید عجیب سے لہجے میں بولے ۔

" نن — نہیں — نہیں — یہ نہیں ہو سکتا — یہ تو میرا سب سے زیادہ ہوشیار شاگرد ہے ۔"

" آپ بیٹھیں — ہم خود ڈاکٹر کو بلوا کر تصدیق کریں گے ، جاؤ محمود ، ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ ۔"

" جی بہتر !" محمود نے کہا اور کمرے سے نکل گیا — استاد ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے راضی کو دیکھنے لگا — آخر ڈاکٹر صاحب اندر داخل ہوئے — انھوں نے راضی کا جائزہ لیا اور بولے :

" حیرت ہے ، تھوڑی دیر پہلے تو اس میں مرنے والی کوئی علامات

نہیں تھیں — خون بھی بہت کم ضائع ہوا تھا ۔"

" تب پھر اس کا بغور جائزہ لیجیے — کہیں اس کے جسم میں زہر داخل کیا گیا ہو ۔" محمود بول اٹھا ۔

" زہر — ارے باپ رے ۔" استاد نے گھبرا کر کہا ۔

ڈاکٹر نے معائنہ کیا ، پھر کچھ اور ڈاکٹروں کو بلایا گیا — سب نے مرنے والے کا جائزہ لیا اور آخر انھیں فیصلہ سنایا :

" اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی موت زہر سے ہوئی ہے ۔"

" کیا !!!" استاد اچھل پڑا اور پھر غصیلی آواز میں پکار اٹھا :

" خابو ! میں تمھیں ہرگز معاف نہیں کروں گا ۔"

" خابو کون ؟" انسپکٹر جمشید الجھن کے عالم میں بولے ۔

" خابو اس کا دوست — رات دونوں میں زبردست جھگڑا ہوا تھا اور ایک دوسرے کو قتل کی دھمکی دی تھی ۔"

" تو آپ کا خیال ہے کہ اسے خابو نے ہلاک کیا ہے ۔" فاروق نے اسے گھورا ۔

" ہاں ! اس کے علاوہ بھلا اور کوئی ایسا کیوں کرتا — راضی تو دوستوں کا دوست تھا ۔" استاد نے کہا ۔

" یوں بات نہیں بنے گی جناب ! آپ اپنے بارے میں — راضی ، خابو اور ان کے گھروں کے بارے میں تفصیل سے بتائیے — اسی صورت میں ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں ۔"

"آپ-آپ کون ہیں؟" اس نے ہتک کر کہا۔

"مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں — آیئے — ہم الگ کمرے میں چلیں، ان لوگوں کو اپنا کام کر لینے دیں۔"

وہ استاد کو لے کر ایک کمرے میں آ بیٹھے:

"اب فرمائیے — آپ کا نام کیا ہے؟"

"استاد طوطے خان۔" اس نے کہا۔

"اوہو — آپ استاد طوطے خان ہیں۔" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو ان کی حیرت پر حیرت ہوئی۔

"جی ہاں — تو آپ مجھے جانتے ہیں۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"نام بہت سُنا ہے، آپ کا۔" انسپکٹر جمشید نے جواب دیا۔

"میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ آپ جیسے مشہور آدمی بھی مجھے جانتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ کا کاروں کا کام ہے — آپ نے ڈرائیور رکھے ہوئے ہیں — کاریں کرائے پر دیتے ہیں، لیکن اپنے ڈرائیوروں سمیت دیتے ہیں — تاکہ کاریں ضائع نہ ہوں — کیوں — ٹھیک ہے نا۔"

"جی ہاں — بالکل۔" اس نے فوراً کہا۔

"تو یہ شخص راضی آپ کا ڈرائیور تھا۔" فرزانہ بولی۔

"جی ہاں! بہت پیارا آدمی تھا — بے چارے کا نہ کوئی آگے نہ پیچھے، دُنیا میں بالکل تنہا، بس مجھے ہی اپنا سب

کچھ سمجھتا تھا — پتا نہیں — کس ظالم کی گولی سے یہ ہلاک ہو گیا۔"

"یہ گولی سے نہیں، زہر سے ہلاک ہوا ہے۔" محمود نے گویا اس کی غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کی۔

"جی نہیں — یہ گولی لگنے سے ہی مرا ہے — اگر کسی نے اسے زہر دیا بھی ہے تو گولی لگنے کی وجہ سے — نہ یہ یہاں آتا، نہ [illegible] اسے زہر دیتا، لیکن میں حیران ہوں — اس کے زخمی ہو جانے کے بعد کسی کو کیا ضرورت تھی اسے زہر دینے کی۔"

"پہلے تو آپ یہ بتائیں، اس کے زخمی ہونے کی اِطلاع کس طرح ملی۔"

"گہری نیند سو رہا تھا، کسی نے فون پر اِطلاع دی کہ میرا شاگرد راضی گولی لگنے سے زخمی ہو گیا ہے۔"

"آپ نے اس سے پوچھا نہیں — وہ کون ہے اور اسے کس طرح اس حادثے کا پتا چلا۔"

"جی نہیں، اتنا ہوش ہی کسے رہ گیا تھا۔" اس نے سرد آہ بھری —

"اور آپ یہاں آئے تو راضی نے کوئی حرکت نہ کی۔"

"جی نہیں — یہی تو افسوس ہے — مرنے سے پہلے وہ چند باتیں تو کر جاتا — یہ تو بتا دیتا کہ اس کا یہ حال کس نے کیا ہے۔"

"محمود — راضی کی جامہ تلاشی لی جا چکی ہو گی، جو چیزیں

نکلی ہوں، وُہ لے آؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی بہتر!" اس نے کہا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا گیا۔

"کیا آپ جانتے ہیں، راضی کا تعلق ایک بہت خطرناک گروہ سے تھا۔"

"جی - یہ - یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اُستاد طوطے خان بھونچکا رہ گیا۔

"جی ہاں - بالکل یہی بات ہے۔"

"میں نہیں مانتا - راضی تو بہت سیدھا سادا آدمی تھا - جُرم سے کوسوں دُور بھاگنے والا۔" اس نے پُر زور انداز میں سر ہلایا -

اسی وقت محمود اندر داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں کچھ چیزیں تھیں - وُہ اس نے میز پر ڈھیر کر دیں - ان میں ایک سگریٹ لائٹر تھا - کچھ ریزگاری تھی - اور ایک دیا سلائی کی ڈبیا بھی تھی:

"لائٹر بھی موجود ہے اور ماچس بھی - یہ کیا بات ہوئی۔"

"راضی سگریٹ پینے کا بہت عادی تھا - لائٹر کے ساتھ ماچس رکھنا ایسی عجیب بات تو نہیں۔" طوطے خان نے منہ بنایا۔

"ہوں ٹھیک ہے -" انسپکٹر جمشید نے چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا - اور ان میں سے ایک رُومال کو اٹھا کر سونگھا،

پھر بولے:

"یہ رومال راضی کا ہی ہے نا؟"

"جی ہاں - بالکل - اسی کا ہے، میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔" اس نے فوراً کہا۔

راضی کی جیبوں سے برآمد ہونے والی چیزوں میں کم از کم ایم آئی پی والا کارڈ نہیں تھا - کچھ سوچ کر انسپکٹر جمشید نے جیب سے وُہ کارڈ نکالے اور طوطے خان کے سامنے کرتے ہوئے بولے:

"ان کارڈوں کو پہچانتے ہیں۔"

طوطے خان نے کارڈ دیکھے اور حیران ہو کر بولا:

"نہیں تو - یہ کیسے کارڈ ہیں۔"

"آپ نے ایسا کوئی کارڈ کبھی راضی کے پاس بھی نہیں دیکھا۔"

"بالکل نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تب پھر ہو سکتا ہے، حملہ آوروں نے کار کرائے پر حاصل کی ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی کیا مطلب؟" طوطے خان نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ابا جان - اگر گروہ کے لوگوں نے راضی کی کار کرائے پر لی تھی تو حملے کے وقت راضی ان کے ساتھ کیوں تھا - یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان کے کار کرائے پر

لیتے وقت ان کے بارے میں راضی کو کچھ پتا نہ ہو ، لیکن حملے کے وقت تو وُہ اندازہ لگا ہی سکتا تھا۔ اس صورت میں وہ ان کے ساتھ کیوں موجود تھا۔"

" تب پھر ہو سکتا ہے۔ اس گروہ کے لوگ اس کے مستقل گاہک ہوں۔ اور پہلے بھی اس کی کار اس قسم کے کاموں کے لیے کرائے پر لیتے رہے ہوں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید، طوطے خان کی طرف مڑے :

" آپ کے ادارے کی کاریں جو لوگ کرائے پر لیتے ہیں۔ ان کا ریکارڈ رکھتے ہیں آپ ؟"

" جی نہیں۔ میرا طریقہ کار یہ ہے کہ میں نے اپنی کاریں اپنے ڈرائیوروں کو دے رکھی ہیں۔ ہر ڈرائیور مجھے سو روپے روزانہ دینے کا پابند ہے اور بس۔ دن بھر اس کی کار کو کوئی کرائے پر لے یا نہ لے۔ یا وُہ ایک دن میں کتنے ہی پیسے کما لے۔ مجھے اس سے غرض نہیں۔ میں تو بس اپنے سو روپے سے غرض رکھتا ہوں۔ مہربانی فرما کر ذرا اب مجھے بھی تفصیل سُنا دیں۔"

" اچھا۔" انھوں نے کہا اور راضی کے زخمی ہونے کی تفصیل سُنا دی۔

" وُہ۔ وُہ لوگ کون تھے ؟" اُستاد نے بوکھلا کر پوچھا۔

" ایک بہت ہی خطرناک گروہ کے لوگ تھے۔ افسوس ، ہم

راضی کی زندگی نہیں بچا سکے۔"

" ابّا جان۔ آپ نے اس دُوسری کار کے نمبر نوٹ نہیں کیے تھے ؟" فرزانہ بولی۔

" اوہ ہاں۔ بالکل نوٹ کیے تھے۔" انسپکٹر جمشید چونک اُٹھے اور پھر طوطے خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے :

" مجرم اس جگہ دو کاروں میں آئے تھے۔ دُوسری کار این ڈی ۴۰۹ تھی۔ آپ اس کار کے بارے میں بتا سکتے ہیں ؟"

" این ڈی چار سو نو۔" طوطے خان نے بوکھلا کر کہا۔

" ہاں ! بالکل یہی نمبر تھا۔ میں بھولا نہیں۔"

" یہ کار بھی میری ہے۔ اور راضی کا دوست خابو اسے چلاتا ہے۔"

" ویری گڈ۔ پھر تو بن گیا کام۔ خابو موقعے سے کار لے کر جانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس گروہ کے کچھ کارکن بھی اس کار میں سوار ہو گئے تھے۔"

" خابو۔ اس سے تو میں اسی وقت ملاقات کروا سکتا ہوں۔" طوطے خان نے پُر جوش انداز میں کہا۔

" بہت خوب ! تو پھر ملوا دیں۔ اس سے ملنا اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

طوطے خان نے فون اپنی طرف سرکا لیا ، لیکن انسپکٹر جمشید

نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا اور بولے :

" نہیں جناب ۔ فون کرنا مناسب نہیں ہوگا ۔ اب خود ہمیں اس کے پاس لے چلیے ۔"

" اچھی بات ہے ، بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔"

وہ کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے ۔ دل دھک دھک کر رہے تھے ۔ راضی ایک اہم سُراغ تھا جسے وہ کھو چکے تھے ، اب راضی کے ساتھی کا سُراغ ملا تھا ، لہذا ان پر جوش کی حالت کیوں نہ طاری ہوتی ۔ آدھ گھنٹے بعد وہ ایک بڑی عمارت کے سامنے رُکے ۔ اس کی دوسری منزل پر ایک کمرے کے سامنے رک کر طوطے خان نے کہا :

" خابو یہاں رہتا ہے ۔ میں کار نمبر این ڈی ۴۰۹ نیچے کھڑی دیکھ چکا ہوں ۔ اس کا مطلب ہے ، وہ اپنے کمرے میں موجود ہے ۔"

" یہ اور اچھی بات ہے ۔" انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا ۔

محمود نے دروازے پر دستک دی ۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا ۔ انسپکٹر جمشید اور وہ تینوں بھی اپنی اپنی گھڑیاں درست کر چکے تھے ۔ جونہی محمود نے دروازے پر ہاتھ مارا ۔ دروازہ کھل گیا ۔ گویا اسے اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا ۔

" خابو ۔ کیا تم جاگ رہے ہو ؟" طوطے خان نے بلند آواز میں کہا ۔

خابو کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا ۔ آخر وہ اندر داخل ہو گئے ۔ طوطے خان آگے آگے تھا اور خابو خابو کہتا جا رہا تھا اور پھر ان کے قدم اندرونی کمرے کے دروازے پر ہی رُک گئے ، خابو کمرے کے فرش کے عین درمیان میں قالین پر اوندھا پڑا تھا اور ایک خنجر اس کی کمر میں دستے تک پیوست کر دیا گیا تھا ۔

" اُف خدا ۔ یہ کیا ہو رہا ہے ۔ خابو بھی گیا ۔" طوطے خان کی آواز کانپ اٹھی ۔

" اس کا مطلب ہے ۔ آپ کے یہ دونوں ڈرائیور اس خطرناک گروہ کے لیے کام ضرور کرتے رہے ہیں ، یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس گروہ کے باقاعدہ کارکن نہ ہوں ، لیکن یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ان کا کوئی تعلق ہو ہی نہ ۔ اگر بات یہی ہوئی تو پھر اس گروہ کو کیا ضرورت تھی ، ان دونوں کو ہلاک کرنے کی ۔"

" میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ۔ یہ کیا ہو رہا ہے ۔ اللہ اپنا رحم فرمائے ۔" طوطے خان نے پریشان آواز میں کہا ۔

" پریشان نہ ہوں ۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے اکرام کو فون کیا اور اس واردات کی اطلاع دی ۔ پھر آگے بڑھے اور خابو کی بھی تلاشی لی ، لیکن اس کی جیب سے کوئی کارڈ برآمد نہ ہوا ۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید طوطے خان کی طرف مڑے اور اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے

بولے:

"آپ کو ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کک۔ کہاں؟" وہ ہکلایا۔

"اپنے دفتر۔ آپ کے پاس جتنی کاریں ہیں، ان سب کے ڈرائیوروں کے نام اور پتوں والے رجسٹر کی ضرورت ہے ہمیں۔ ان تینوں کے ساتھ چلے جائیے۔ خان رحمان تم میرے ساتھ رہو۔"

"آئیے جناب چلیں۔" محمود نے فوراً اُٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اس کے ساتھ باہر نکلے اور خان رحمان والی کار میں روانہ ہوئے۔ جونہی طوطے خان نے اپنے دفتر کا دروازہ کھولا، ایک تیز آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی ــــ

بریف کیس کی موت

انھوں نے چونک کر سامنے دیکھا، کمرے کے بیچوں بیچ ایک کرسی رکھی تھی، اس کرسی میں ایک عجیب سا آدمی بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا ننھا سا پستول تھا، اس کی اُنگلی ٹریگر پر جمی تھی، انداز ایسا تھا جیسے ابھی گولی مار دے گا۔ چند لمحے تک سکتے کا عالم طاری رہا، پھر طوطے خان نے بھنّا کر کہا:

"کون ہو تم اور میرے دفتر میں کس طرح داخل ہوئے؟"

"تالا کھول کر۔" فاروق بول اٹھا۔

"کیا مطلب۔ میں نے آپ سے تو نہیں پوچھا۔" طوطے خان تلملا اٹھا۔

"جواب تو یہی ملے گا، ان سے بھی پوچھ کر دیکھ لیں۔" فاروق مسکرایا۔

"ہاں بالکل ٹھیک، اس سے مناسب جواب تو اس سوال کا ہو

ہی نہیں سکتا۔" پستول والے نے کہا۔

"چلیے خیر، یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ تالا کھول کر اندر داخل ہوئے ہیں، سوال یہ ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟" طوطے خان بولا —

"اس لیے کہ میں جانتا تھا — یہ لوگ یہاں ضرور پہنچیں گے، میں ان کا استقبال کرنے کے لیے پہلے ہی پہنچ گیا۔"

"ذرا وضاحت کریں جناب، اس طرح مزا نہیں آئے گا۔"

"ہاں ضرور — کیوں نہیں — ہمارا پروگرام یہ تھا کہ تمھیں، تمھارے انکل پروفیسر داؤد اور خان رحمان کو ایک ہی وقت ٹھکانے لگا دیا جائے، ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ تم لوگ بہت چالاک ہو، ہر بار بچ نکلتے ہو، لہٰذا منصوبہ یہ بنایا کہ بچ نکلنے کے امکانات کو بھی سامنے رکھا جائے — اور اس صورت میں بھی کوئی ایسی ترکیب کر لی جائے کہ ہمارا دوسرا وار خالی نہ جائے؛ چنانچہ تمھارے لیے میں یہاں موجود ہوں —"

"لیکن اس طرح بھی تمھاری کامیابی اُدھوری رہ جائے گی — اس لیے کہ یہاں ہم سب نہیں آئے، صرف تین آئے ہیں۔"

"اس سلسلے میں بھی منصوبہ بندی کر لی گئی تھی — تمھارا گھر ملبے کا ڈھیر بن جانے کی صورت میں یا تو تم بیگم شیرازی کے گھر میں آتے یا خان رحمان کے گھر — تیسرا گھر پروفیسر داؤد کا ہے — لہٰذا

تینوں گھروں کے آس پاس ایم آئی پی کے کارکن منڈلا رہے ہیں اور اس وقت تک اپنی کارروائی شروع کر چکے ہیں۔"

"اوہ!" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا — انھیں فوری طور پر انکل خان رحمان کے گھر کا خیال آیا تھا، کیونکہ اس وقت ان کا کمزور پہلو وہی گھر تھا — وہاں عورتیں، بچے اور پروفیسر داؤد موجود تھے، اور ان لوگوں کے مقابلے میں ایک طرح سے بہت کمزور تھے۔

"کیوں — سٹی گم ہو گئی۔" پستول والا مُسکرایا۔

"جی نہیں — ابھی تک تو نہیں ہوئی — ہاں — ہو جائے تو کچھ کہہ نہیں سکتے — آپ اپنا تعارف بھی تو کرائیے۔"

"ضرور کیوں نہیں — میں اپنا نام بتائے بغیر کہیں بھی کوئی کام نہیں کرتا — مجھے شارگون کہتے ہیں۔" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

"شارگون! یہ کیسا نام ہوا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہو سکتا ہے، تمھیں میرا نام پسند نہ آیا ہو، لیکن مجھے اپنا یہ نام بہت پسند ہے۔" وُہ مسکرایا۔

"خیر خیر — ہو گا، ہمیں کیا — ہماری طرف سے تو آپ اپنا نام شارشون رکھ لیں۔" فارُوق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تو پھر اس پروگرام میں — یا یوں کہہ لو کہ اس منصوبے میں مَیں اپنا کام ختم کر رہا ہوں، لو دُوسری دُنیا کے سفر پر روانہ ہو جاؤ۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی اُنگلی حرکت میں آئی۔ لیکن

اسی وقت محمود نے چیخ کر کہا:

"ایک منٹ جناب — ایک بات تو رہ ہی گئی اور اگر وہ بات جانے بغیر ہم موت کی گود میں جا سوئے تو آپ کو آپ کے خوابوں میں آکر بہت تنگ کریں گے — یہ سوچ لیں۔"

"ہاں واقعی! ہم خوابوں میں آکر تنگ کرنے میں بہت ماہر ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"یہ سارا منصوبہ کس لیے ترتیب دیا گیا ہے — ارے ارے — مسٹر طوطے خان — تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟" محمود چلا اٹھا۔

شارگون نے چونک کر نظریں گھمائیں — یہی وہ لمحہ تھا جب محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک ساتھ شارگون پر چھلانگیں لگائیں اور اسے ساتھ لیے فرش پر ڈھیر ہو گئے، شارگون گرنے سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ طوطے خان تو کہیں بھی نہیں گیا تھا — وہ تو اپنی جگہ پر جوں کا توں موجود تھا — گرتے گرتے بھی شارگون نے ٹریگر دبا دیا — طوطے خان کے منہ سے ایک دہشت زدہ چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا — ساتھ ہی دیوار کا پلستر اکھڑ کر نیچے گرا —

"اُستاد طوطے خان صاحب — گولی تو دیوار کو لگی ہے — آپ کس لیے تڑپ رہے ہیں؟" محمود حیران ہو کر بولا۔

"م میں — میں — یعنی کہ میں" طوطے خان ہکلایا۔

"ہاں! آپ بالکل ٹھیک ہیں — مہربانی فرما کر ہماری مدد کریں، کیونکہ یہ شخص عجیب قسم کا شخص ہے۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"عجیب قسم کا شخص — کیا مطلب؟" طوطے خان نے بوکھلا کر کہا۔ اب وہ لڑکھڑاتی ٹانگوں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ گوشت اور ہڈیوں کا نہیں — لکڑی اور لوہے کا بنا ہوا ہے — جلدی ہماری مدد کو آئیے۔"

تینوں اس پر چڑھے ہوئے تھے — فاروق نے اس کی ایک ٹانگ کو قابو میں کر رکھا تھا تو فرزانہ نے دوسری ٹانگ کو، محمود اس کے پستول والے ہاتھ پر دونوں ہاتھ جمائے ہوئے تھا — نتیجہ یہ کہ اس کا ایک ہاتھ آزاد تھا اور یہ آزاد ہاتھ اس نے محمود کی گردن میں ڈال رکھا تھا، وہ اس کے ذریعے محمود کی گردن کے گرد شکنجہ تنگ کرتا جا رہا تھا اور یہ صورتِ حال محمود کے لیے خوش گوار نہیں تھی۔

"م — میں کیا کروں؟" طوطے خان کانپ کر بولا۔

"میری گردن پر سے اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کریں — آپ کی ہمارے لیے یہی امداد کافی ہو گی۔"

"اچھ — چھی بات ہے۔" یہ کہہ کر طوطے خان لڑکھڑاتے انداز میں اس جمگھٹے کی طرف بڑھا اور شارگون کے اس ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا جس سے اس نے محمود کی گردن کو دبا رکھا تھا —

اور اسے گردن سے ہٹانے کے لیے زور لگانے لگا، لیکن شارگون کا
ہاتھ ہلا تک نہیں:

"اُف خدا— آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ بوکھلا اٹھا۔

"کیا مطلب— کون ٹھیک کہہ رہا تھا؟" محمود حیران ہو کر بولا۔

"آپ— یہ شخص تو واقعی لوہے کا بنا ہوا ہے۔"

"اچھا تو پھر یوں کریں کہ پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیں۔"
محمود بولا—

"اچھی بات ہے۔ لل— اگر پستول چل گیا۔" وہ بولا۔

"فکر نہ کریں۔ نالی کے رُخ کا دھیان رکھیں— نالی دروازے کی
طرف ہے— اسی طرف رہے— ایسی صورت میں اگر گولی چل بھی گئی
تو ہم میں سے کسی کو نہیں لگے گی۔"

"اچھا! میں کوشش کرتا ہوں، لیکن خیال رہے، میں نے ایسے
کام کبھی نہیں کیے، میں تو ایک سیدھا سادا آدمی ہوں۔"

"اچھا— خیال رکھیں گے، آپ فکر نہ کریں۔" فاروق نے منہ
بنایا—

اُستاد طوطے خان نے اپنے ہاتھ شارگون کے ہاتھ پر سے ہٹا
لیے— اور دونوں ہاتھ پستول پر جما دیے— اچانک وہ زور سے اچھلا
اور محمود کے سر سے اس زور سے ٹکرایا کہ اس کے دونوں ہاتھ پستول
والے ہاتھ پر سے ہٹ گئے، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا

چھا گیا— پستول والا ہاتھ آزاد ہونے کی دیر تھی کہ اس نے فاروق
اور فرزانہ کو بھی اُچھال پھینکا— ایک منٹ بعد قدرے ہوش میں آ
کر انھوں نے دیکھا— اب وہ دروازے کی طرف کھڑا تھا— پستول
ایک بار پھر ان کی طرف اٹھا ہوا تھا— اُستاد طوطے خان بے حس و
حرکت فرش پر اوندھا پڑا تھا—

"یہ— یہ کیا ہوا؟"

"پتا نہیں— اس نے استاد طوطے خان پر کیا گُر آزمایا تھا—
نہ جانے اس کے کس جگہ چوٹ لگی— بہت بُری طرح اُچھلا تھا۔"
محمود نے آنکھوں میں آ جانے والے پانی کو رُومال سے صاف کرتے
ہوئے کہا۔ اُستاد طوطے خان کا سر چونکہ اس کی ناک سے لگا
تھا، اس لیے آنکھوں میں فوری طور پر پانی آ گیا تھا۔

"تمھارا کھیل ختم ہو گیا، تم ہار گئے۔" شارگون نے طنزیہ
انداز میں کہا۔

"جب تک ہم زندہ ہیں، اس وقت تک کچھ نہیں کہا جا سکتا—
خُدا جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، پہلے تو آپ یہ بتائیں— آپ
نے استاد طوطے خان پر کیا وار آزمایا ہے۔"

"میں اپنے وار دوسروں کو بتایا نہیں کرتا، ویسے وہ جوجِتسو
کا ایک وار تھا جو بالکل غیر محسوس طور پر آزمایا جاتا ہے۔"

"ہوں— تو پھر چلیے— اپنا پروگرام شروع کیجیے، کیونکہ ہمیں تو

انکل خان رحمان کے گھر میں موجود اپنے ساتھیوں کی زیادہ فکر ہے۔"

"لیکن افسوس، مر کر تم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکو گے۔"

"یہ صرف آپ کا خیال ہے، ورنہ ہم تو مرنے کے بعد بھی بہت کچھ کر دکھائیں گے۔" فاروق مسکرایا۔

"تو پھر میں تمھاری آرزو پوری کیے دے رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹریگر دبا دیا۔ فائر ہوا، لیکن اس کی انگلی کے حرکت کرنے سے ایک سیکنڈ پہلے ہی محمود، فاروق اور فرزانہ مختلف سمتوں میں چھلانگیں لگا چکے تھے۔ گولی ایک بار پھر دیوار میں لگی، اس نے دوسری بار ٹریگر دبایا، اس بار گولی محمود کے کندھے کو قریب چھوتی گزر گئی۔ وہ چیخ مار کر گرا اور اس بری طرح تڑپا کہ اس کی دونوں ٹانگیں شارگون کے سینے پر لگیں۔ یہ اس کی ایک چال تھی، کیونکہ گولی تو صرف اس کے کپڑوں کو چھو کر گزر گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شارگون بری طرح لڑکھڑا گیا۔ ایسے میں فاروق بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور پورے زور میں اس سے ٹکرا گیا، اگر وہ نہ ٹکراتا تو شارگون سنبھل چکا تھا، لیکن اس کا دھکا لگنے کے بعد شارگون کے لیے سنبھلنا ناممکن ہو گیا۔ ساتھ ہی فرزانہ حرکت میں آئی اور عین اس کے اوپر گری۔ ایسے میں محمود کو اپنے چاقو کا خیال آ گیا، وہ تیزی سے جھکا اور ایڑی کھسکا کر چاقو نکال لیا۔ دوسرے ہی لمحے چاقو نکل چکا

تھا، وہ بلا کی رفتار سے جو شارگون کی طرف بڑھا، دھڑام سے اوندھے منہ گرا، وہ استاد طوطے خان کی ٹانگ میں الجھ گیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی۔ اس نے چاقو والا ہاتھ سر سے باہر نکال دیا، ورنہ چاقو خود اس کے لگ گیا تھا۔ لیٹے لیٹے اس نے چاقو والے ہاتھ کو شارگون کی طرف گھما ڈالا۔

چاقو اس کی پنڈلی کاٹتا گزر گیا۔ شارگون کے منہ سے نکلنے والی چیخ بہت ہولناک تھی۔ ساتھ ہی فرزانہ نے نعرہ لگایا:

"میں نے اس کے ہاتھ سے پستول نکال لیا ہے۔"

"اور یہ اس لیے ممکن ہوا کہ اس کی پنڈلی کٹ گئی۔" فاروق بولا۔

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں، لیکن یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں۔ ہمیں فوری طور پر انکل خان رحمان کے گھر پہنچنا ہے۔ نہ جانے وہاں کیا حال ہے۔ سوال یہ ہے کہ شارگون کا کیا کریں۔"

"میں پستول ہاتھ میں پکڑے یہاں موجود رہوں گی، تم انکل اکرام کو فون کرتے جانا۔ جونہی وہ یہاں پہنچیں گے، میں بھی تمھاری طرف روانہ ہو جاؤں گی۔ اس وقت تک تم وہاں پہنچ کر دخل اندازی کر ہی سکتے ہو۔"

"ہوں ٹھیک ہے، اس کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"پستول میرے ہاتھ میں دے کر بھی تو آپ لوگ جا سکتے ہیں۔" طوطے خان نے کہا۔

"لیکن آپ کو پستول چلانا نہیں آتا، شارگون جیسا چالاک آدمی آپ کو جُل دے جائے گا۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہاں! یہ تو ہے۔ میں کیا کروں۔" طوطے خان بولا۔

"آپ کاروں والا رجسٹر لے کر خابو کے فلیٹ میں پہنچ جائیں۔"

"لیکن اس طرف بھی تو حملہ ہو سکتا ہے۔"

"وہاں ابا جان موجود ہیں، ان لوگوں کی دال آسانی سے نہیں گل سکے گی۔ آپ بے فکر ہو کر وہاں جا سکتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا۔

"لیکن ابھی آپ پولیس کے آنے تک یہیں ٹھہریں، کیا خبر ہماری بہن کو آپ کی مدد کی ضرورت پیش آ جائے۔" محمود فکر مندانہ لہجے میں بولا۔

"محمود! میرے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

دونوں نے شارگون پر ایک نظر ڈالی، اس کی پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ لہذا فی الحال اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا؛ چنانچہ دونوں باہر نکل آئے۔ پہلے اکرام کو فون کیا، لیکن اکرام تو وہاں تھا ہی

نہیں۔ اکرام تو پہلے ہی خابو کے گھر پہنچا ہوا تھا؛ چنانچہ انھوں نے حوالدار محمد حسین آزاد کو فون پر ہدایات دیں اور آندھی اور طوفان کی طرح خان رحمان کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ گھر کے سامنے پہنچ کر ان کی حالت اور بھی غیر ہو گئی، کیونکہ دروازہ باہر سے بند تھا۔

○

محمود، فاروق، فرزانہ اور استاد طوطے خان کو گئے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک کانسٹیبل ان کے قریب آتے ہوئے بولا:

"کوئی شخص خابو سے ملنے آیا ہے۔ خود کو اس کا دوست بتاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، اسے یہیں لے آئیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ کانسٹیبل دروازے کی طرف مڑ گیا۔

"آخر یہ کیا ہو رہا ہے جمشید؟"

"ابھی تک کچھ پتے نہیں پڑا۔"

اسی وقت لمبے قد کا ایک پتلا دبلا آدمی کانسٹیبل کے ساتھ آتا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آتے ہی بولا:

"یہاں کیا ہوا ہے جناب۔ پولیس کا یہاں کیا کام؟"

"کیا آپ خابو کے دوست ہیں؟"

"ہاں! بہت گہرا دوست، اسے کیا ہوا؟"

"کسی نے اسے ہلاک کر دیا ہے۔"

"کیا!" وہ اچھل پڑا اور پھر اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"ہاں! آیئے۔ آپ کو اس کی لاش دکھائیں۔"

لاش دیکھ کر اس کی حالت اور بھی غیر ہو گئی، پھر اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا:

"اب۔ اب میں اس کا کیا کروں گا۔"

"کس کا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"خابو نے ایک امانت میرے پاس رکھوائی تھی۔"

"اور وہ کیا چیز ہے؟" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

"پتا نہیں۔ وہ ایک بریف کیس ہے۔ اس میں کیا ہے، میں نہیں جانتا۔"

"اوہ! تب تو اس بریف کیس کی پولیس کو بہت ضرورت ہے، وہ کہاں ہے؟"

"میرے گھر۔" اس نے کہا۔

"چلیے! ہم اسی وقت آپ کے ساتھ چل رہے ہیں۔ خان رحمان تم میرے ساتھ چلو گے یا یہیں ٹھہرنا پسند کرو گے۔" وہ بولے۔

"میں یہاں ٹھہر کر کیا کروں گا۔"

"ہاں! بات ٹھیک ہے، تو پھر آؤ۔"

وہ لمبے آدمی کو ساتھ لے کر باہر نکلے اور جیپ میں بیٹھ گئے، جیپ ان کا عملہ لے آیا تھا:

"آپ کا نام کیا ہے جناب؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ڈی خان۔" وہ بولا۔

"تو مسٹر ڈی خان۔ کہاں چلنا ہے؟"

"راجر روڈ۔ گلی نمبر نو۔"

جیپ چل پڑی۔ ڈی خان کی موجودگی میں انھوں نے کوئی بات کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ آخر بیس منٹ بعد وہ گلی نمبر نو میں داخل ہوئے اور ڈی خان کے پیچھے ایک کمرے تک آئے۔ جونہی کمرے میں داخل ہوئے، ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، کمرے کے عین درمیان میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ اس میز پر سیاہ رنگ کا ایک بریف کیس موجود تھا۔ کمرے کے دروازے کے دائیں اور بائیں دو دو آدمی سٹین گنیں لیے کھڑے تھے۔ جونہی وہ اندر داخل ہوئے، دروازہ بند کر دیا گیا۔ دروازہ بند کرنے والا ایک پانچواں آدمی تھا، اس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ

ناچ رہی تھی۔ ان کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس
نے کہا:

"محمود، فاروق اور فرزانہ اس وقت تک دُوسری دُنیا کا ٹکٹ
لے کر جا بھی چکے ہوں گے ۔ خان رحمان کے گھر میں بھی اس
وقت ایک خُونی ڈرامہ شُروع کیا جا چکا ہے ۔ بس تم دو رہ
گئے تھے ۔ تمھارے لیے یہ انتظام کیا گیا۔ یعنی خابو کے دوست
کو بھیج کر تم لوگوں کو یہاں بلوا لیا گیا۔ اب تم دیکھ ہی رہے
ہو ۔ موت تم سے کتنے کم فاصلے پر ہے۔ سٹین گنوں کی گولیوں
کی موت مرنا اگر پسند ہے تو بھی ٹھیک ہے اور اگر سٹین گنیں
پسند نہ ہوں تو اس بریف کیس کی موت مر جاؤ۔ یہی ہمارے
باس کی خواہش ہے۔"

"کیا مطلب ۔ بریف کیس کی موت مر جائیں؟" انسپکٹر جمشید
نے حیران ہو کر کہا۔ گھبراہٹ یا پریشانی کا ان کے چہروں پر نام
تک نہیں تھا۔

"ہاں! موت کی ایک صورت اس بریف کیس میں بھی موجود
ہے ۔ بریف کیس تین زیرو پر کھلے گا۔ کیا خیال ہے، تجربہ
کرنا ہے۔"

"اس میں کیا ہے ۔ کیا یہ نہیں بتایا جائے گا؟" انسپکٹر جمشید
مسکرائے ۔

"نہیں۔ اس طرح تو تم پہلے سے ہوشیار ہو جاؤ گے۔"

"خیر! میں یہ تجربہ کروں گا۔ اگر میں نے خود کو اور
اپنے دوست کو بریف کیس کی موت سے بچا لیا تو پھر تم لوگ
کیا کرو گے۔"

"پھر بھی تمھیں زندہ جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جانا
تو یہاں سے مر کر ہی ہو گا۔"

"ہوں خیر کوئی بات نہیں ۔ میں اس بریف کیس کو بھی دیکھوں
گا اور تمھاری سٹین گنوں کو بھی۔"

انھوں نے کہا اور بریف کیس کی طرف ایک ایک قدم اٹھانے
لگے ۔ خان رحمان نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ دیکھ کر وہ رک گئے
اور بولے:

"نہیں خان رحمان ۔ تم بریف کیس سے دُور ہی رہو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، زندگی کے سفر میں مَیں ساتھ رہا، اب تم
موت کے سفر پر روانہ ہو رہے ہو تو ساتھ کس طرح چھوڑ دوں۔"
خان رحمان بھرپور انداز میں مسکرائے۔

"میں جانتا ہوں خان رحمان ۔ تم مجھ سے پہلے جان دینا پسند
کرو گے، لیکن میری درخواست ہے، تم بریف کیس سے دُور
ہی رہو، معلوم نہیں، اس میں کیا ہے ۔ ایک ہی وقت میں
ہم دونوں کیوں زد میں آئیں ۔ ہم میں سے ایک بچ کیوں نہ

جائے، تاکہ ان لوگوں کو بیگمی کے ناچ کی تھوڑی سی مشق تو
کرا ہی دی جائے۔"

"ہوں — چلو منظور ہے۔" خان رحمان نے کچھ سوچ کر کہا
اور بریف کیس سے دُور ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دیوار
سے جا لگے؛ تاہم اس صورت میں بھی سٹین گنوں کی زد میں تو
تھے ہی، لیکن ان کی طرف تو انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں
دیکھا تھا۔

انسپکٹر جمشید نے بریف کیس کے پاس پہنچ کر ایک نظر ان
پر ڈالی اور پھر دوسری طرف مُڑ کر بریف کیس پر جھک گئے۔
یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کے تالے کے نمبر ملا رہے ہوں۔

اچانک بریف کیس ہوا میں اڑتا ہوا دونوں سٹین گنوں والوں
کے سروں پر لگا، ساتھ ہی وُہ کھل گیا اور اس میں سے ایک
پھنیر سانپ نکل پڑا۔ فرش پر گرتے ہی اس نے پھن اٹھا دیا،
پھنکار ماری اور دوسرے سٹین گنوں والوں کی طرف بڑھا۔ سٹین
گنیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں اور وُہ افراتفری کی حالت
میں پیچھے ہٹے — یہاں تک کہ دیوار سے جا لگے۔ ایسے میں
پانچواں آدمی حرکت میں آیا، اس نے سٹین گنوں کی طرف چھلانگ
لگائی تھی، لیکن ایسے میں خان رحمان کی ٹانگ چل گئی۔ وُہ ان
کی ٹانگ میں اس بُری طرح اُلجھا کہ اوندھے مُنہ گرا، اسی

وقت انسپکٹر جمشید اچھلے اور سٹین گنوں پر گرے۔ دوسرے ہی لمحے
دونوں سٹین گنیں اٹھاتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ادھر پھنیر
سانپ ایک جگہ جم کر کھڑا تھا اور اس کا منہ ان دونوں کی طرف
تھا جو دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ وہ اس طرح دیوار سے چپکے کھڑے
تھے گویا اب کبھی دیوار سے الگ نہیں ہو سکیں گے۔

اچانک گولیوں کی تڑا تڑ گونجی۔ سانپ کا سر اڑ گیا۔ اس کا
دھڑ فرش پر بل کھانے لگا۔ یہ دیکھ کر ان دونوں کی جان میں
جان آئی۔

"اب تم چاروں ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ باقی دو تو ہاتھ اٹھانے
کے قابل نہیں رہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ کمرے میں اس وقت
ڈی خان اور اس کے پانچ ساتھی موجود تھے۔

انھوں نے بریف کیس کچھ اس انداز سے مارا تھا کہ دونوں کے
سروں سے خون بہہ نکلا تھا اور وُہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکے
تھے۔ باقی چاروں کے ہاتھ سروں سے بلند ہو گئے۔ اتنی دیر
میں خان رحمان نے باقی کی دو سٹین گنیں بھی اٹھا لیں۔

"خان رحمان — ان دونوں بے ہوش دشمنوں کا بھی خیال رکھنا، کیا
خبر یہ ہوش میں ہوں اور جان بوجھ کر بے ہوش بن رہے ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" وُہ بولے۔

"ہاں بھئی — اب بتاؤ — آخر یہ کیا چکر ہے؟"

"ایم آئی پی کے کارکن چکر کی تفصیل نہیں بتایا کرتے۔" پانچویں نے جل بھن کر کہا۔

"اوہو اچھا — بھئی واہ۔" انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

"چلو پھر نام ہی بتا دو۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہاں ضرور! میرا نام ارسلان ہے۔"

"اب ہم تم لوگوں کی تلاشی لیں گے۔ اگر کسی نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو گولیاں جسم کے پار ہو جائیں گی۔" انسپکٹر جمشید بولے اور پھر خان رحمان کو تلاشی لینے کا اشارہ کیا۔

تلاشی میں کوئی کام کی چیز برآمد نہ ہوئی، آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"سنو ڈی خان — مجھے ایک بات بتا دو اور وہ یہ کہ تمھارا باس کون ہے؟"

"جی — کیا کہا — باس!"

ڈی خان کی آواز کانپ گئی — انھیں یوں لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو —

خُون کا بازار

ان لوگوں کے روانہ ہونے کے فوراً بعد بیگم خان رحمان نے ظہور سے کہا:

"ظہور! تم دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کر دو — اور خبردار — کسی کے لیے بھی دروازہ نہ کھولنا۔"

"جی بہتر! میرا دماغ نہیں پھر گیا کہ دروازہ کھول دوں گا۔" اس نے کہا اور دروازے بند کرنے چلا گیا۔

"اب ہم اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں۔ یا کوئی پروگرام بنا سکتے ہیں۔"

"لیکن افسوس — مزا نہیں آئے گا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی کیا مطلب — مزا کیوں نہیں آئے گا؟"

"اس لیے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ یہاں نہیں ہیں۔"

"ہاں! یہ تو ہے — خیر کوئی بات نہیں — وہ بھی آ ہی جائیں گے۔" بیگم جمشید بولیں۔

"یہ نہ کہیں بھابی۔ اب وہ مجھے اتنی جلدی آتے نظر نہیں آتے۔ یہ معاملہ کوئی معمولی معاملہ محسوس نہیں ہو رہا۔"

"تب پھر۔ آپ ہی بتائیں۔ کیا کیا جائے۔"

اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے خیال کیا۔ ظہور آ رہا ہے، لیکن پھر انھیں چونکنا پڑ گیا، کیونکہ آواز ایک سے زائد آدمیوں کی تھی۔ سامنے دیکھا تو ظہور دو آدمیوں کے ساتھ چلا آ رہا تھا:

"ظہور یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تمھیں تو دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے کے لیے بھیجا تھا۔" بیگم خان رحمان بولیں۔

"ج۔ جی ہاں۔ بب بالکل بھیجا تھا۔ اور۔ اور میں بند کر آیا ہوں۔"

"لیکن یہ ساتھ کن لوگوں کو لے آئے ہو؟"

"یہ لوگ میرے دروازے بند کرنے سے پہلے ہی اندر آ چکے تھے۔" وہ بولا۔

"تو پھر۔ تم نے انھیں باہر کیوں نہ نکالا۔"

"اس۔ اس لیے کہ۔ ان کے ہاتھوں میں۔ ہاتھوں میں۔"

ظہور جملہ مکمل نہ کر سکا۔ انھوں نے دیکھا۔ ظہور کے ساتھ آنے والوں کے ہاتھ کمر کی طرف تھے:

"کیا ہے تمھارے ہاتھوں میں؟" بیگم جمشید تلملا اٹھیں۔

انھوں نے آہستہ آہستہ ہاتھ آگے کر دیے۔ دوسرے ہی لمحے وہ لرز اٹھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں چمک دار پھلوں والے دو خنجر تھے۔

"کیا خیال ہے، ان کے بارے میں۔" ان میں سے ایک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! اچھے ہیں، تم کیا چاہتے ہو؟" بیگم جمشید نے منہ بنایا۔

"تم سب کی موت۔" ایک نے سرسراہٹ زدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں! کیا ضرورت پڑ گئی ہماری موت کی۔" بیگم جمشید بولیں۔

"تمھاری موت ہمارے لیے خوشیوں کا پیغام لائے گی۔ بہت بڑا انعام مقرر کیا گیا ہے۔" دوسرا بولا۔ پہلے نے اسے تیز نظروں سے گھورا اور پھر سخت لہجے میں بولا:

"روڈی۔ چپ رہو۔ ضرورت سے زائد بات بتانے کی ہمیں قطعاً اجازت نہیں ہے۔"

"اوہ ہاں شادے۔ مجھے افسوس ہے، میں ذرا بہک گیا تھا۔"

"تم میں بس یہی بات تو بری ہے۔ زبان کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔"

"آیندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔ معاف کر دیں مسٹر شادے۔" روڈی نے گھبرا کر کہا۔

"خیر - معاف کیا - چلو بھئی - تم ایک لائن میں کھڑے ہو جاؤ۔"

"کیا پروگرام ہے بھئی؟" بیگم جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ بظاہر وہ بہت خوش باش نظر آ رہی تھیں، لیکن اندر سے ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"ہم نے کہا ہے، ایک لائن میں کھڑے ہو جاؤ - ہمیں یہاں خون کا بازار گرم کرنا ہے۔"

"خون کا بازار۔" بیگم جمشید نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں بھابی - کیا بات ہے؟" پروفیسر داؤد پریشان ہو کر بولے۔

"میں سوچ رہی ہوں - اگر اس وقت یہاں فاروق موجود ہوتا تو فوراً کہہ اٹھتا، یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔"

ان کے چہروں پر پھیکی پھیکی سی مسکراہٹیں ناچ گئیں۔ اب وہ ان کے سامنے ایک لائن میں کھڑے تھے:

"تم میں سے جو سب سے پہلے مرنا چاہتا ہے، لائن سے آگے نکل آئے - لیکن نہیں - تم میں سے کون آگے نکلے گا بھلا، تم سب تو پیچھے ہی پیچھے ہٹو گے۔" شادا کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

ان سب نے ایک ساتھ قدم اٹھا دیے -

"یہ - یہ کیا - تم تو سب آگے بڑھ آئے ہو۔" روڈی نے گھبرا کر کہا۔

"واقعی - یہ تو بہت عجیب بات ہے - پہلے مرنے کے شوق میں سبھی نے قدم اٹھا دیے۔" بیگم جمشید طنزیہ انداز میں ہنس دیں۔

"میں کہتا ہوں - صرف ایک آگے بڑھے۔"

"صرف ایک میں ہی تو آگے بڑھا ہوں۔" پروفیسر داؤد نے فوراً کہا۔

"غلط - تمھارے ساتھ یہ سب بھی آگے بڑھے ہیں۔" شادے نے چیخ کر کہا۔

"تو پھر تمھیں کیا - تمھیں تو اپنا کام کرنا ہے - شروع کرو۔"

"میں نے سوچا تھا - باری باری تم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتاروں گا، خیر - روڈی - ایک سرے سے تم شروع ہو جاؤ - دوسرے سے میں - چلو آگے بڑھو۔"

دونوں نے قدم آگے بڑھائے اور لائن کے ایک ایک سرے کی طرف بڑھے - ایسے میں انھوں نے اپنے جسموں میں تھرتھری دوڑتی محسوس کی -

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی -

"کیا میں یہ فون سن سکتی ہوں؟" بیگم جمشید جلدی سے بولیں۔

"ہرگز نہیں - تم فون کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتیں۔" شادا غرایا۔

" تمھاری مرضی - اس طرح تم اور زیادہ خطرہ مول لو گے۔"
" کیا مطلب - خطرہ کس طرح مول لیں گے ہم؟" روڈی چونکا۔
" فون کرنے والا جب یہ دیکھے گا کہ گھنٹی تو بج رہی ہے، لیکن ریسیور کوئی نہیں اٹھا رہا تو وہ صورتحال معلوم کرنے چلا آئے گا - کیا خبر یہ کسی پڑوسی کا فون ہو - کیا اس طرح تم خطرہ مول نہیں لو گے؟" بیگم جمشید نے جلدی جلدی کہا۔
" ہوں ٹھیک ہے، لیکن ہم تو تم لوگوں کو قتل کرنے پر تُلے ہیں، پھر تم ہمیں ہی ترکیب کیوں بتا رہی ہو؟" شادا مسکرایا۔
" اوہ - مجھ سے یہ کیا غلطی ہوئی؟" بیگم جمشید نے بوکھلا کر کہا۔
" چلو خیر - اب تو ہو ہی گئی - اب تم فون سن لو اور فون کرنے والے سے صرف اتنا کہہ دو کہ گھر کے افراد کہیں گئے ہوئے ہیں۔"
" اچھی بات ہے۔" انھوں نے کہا اور لائن سے نکل کر فون کا ریسیور اٹھا لیا - ان کا دل اب اور زور سے دھڑک رہا تھا۔
" ہیلو۔" وہ بولیں۔
" کون بول رہا ہے - کیا یہ تنویر احمد خان کا مکان ہے؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔
" کیا کہا - سیدھے یہاں آ رہے ہیں - اوہ۔" وہ بولیں۔
" محترمہ - میں نے پوچھا ہے، کیا یہ تنویر احمد خان کا مکان

ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ سیدھے یہاں آ رہے ہیں - مجھے کیا ضرورت پڑی ہے، یہاں آنے کی - مجھے تو تنویر احمد خان کو ایک پیغام دینا ہے اور بس۔"
" جی بہتر - آ جائیے۔"
انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا:
" کیا بات ہے - کون آ رہا ہے ادھر؟"
" تمھیں اس سے کیا، تم جلد از جلد اپنا کام مکمل کر لو، ورنہ پھر شاید تمھیں موقع نہ مل سکے۔" بیگم جمشید نے خوش ہو کر کہا۔
" شاید تمھارا دماغ چل گیا ہے، موت کو سر پر منڈلاتے دیکھ کر۔"
" ہو سکتا ہے، یہی بات ہو - تم اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟"
" ضرور کوئی گڑبڑ ہے - کیا خیال ہے روڈی؟"
" ہاں ٹھیک ہے، ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، پھر کیا کیا جائے؟"
" ان لوگوں کو ایک کمرے میں بند کر کے ہم آنے والے کا انتظار کر لیتے ہیں۔"
" بالکل ٹھیک - چلو بھئی - اپنی پسند کے کمرے میں داخل ہو جاؤ۔"
بیگم جمشید نے مہمان خانے کا رخ کیا - وہ سب ان کے پیچھے اندر داخل ہو گئے، شادے نے فوراً دروازہ بند کر لیا اور باہر سے چٹخنی لگا دی:

"آؤ بھئی - اب دروازے پر چلیں - اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد ان سے نبٹیں گے۔" انھوں نے شادے کی آواز سُنی —

دونوں دروازے پر آ کر بیٹھ گئے، لیکن آدھ گھنٹا گزر جانے پر بھی کوئی نہ آیا:

"شاید اس عورت نے ہمیں بے وقوف بنایا ہے۔" روڈی بڑ بڑایا —

"ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے - آؤ انھیں کمرے سے نکال کر ان کا تیا پانچہ کریں۔"

دونوں وہاں سے مہمان خانے کے دروازے پر آئے، چٹخنی گرائی اور دروازہ کھولنا چاہا، لیکن دروازہ تو دوسری طرف سے بند کر دیا گیا تھا —

"دروازہ کھولو، ورنہ ہم اسے توڑ بھی سکتے ہیں۔"

"توڑ دو - ضرور توڑ دو۔" اندر سے بیگم جمشید بولیں۔

"چلو بھئی روڈی - یہ یوں نہیں مانیں گے - یہ دروازہ بھلا کب تک ہمارے سامنے ٹکے گا۔" شادا بولا۔

دروازے پر ٹکریں ماری جانے لگیں - اور جب دروازہ اندر کی طرف گرا اور وُہ اندر داخل ہوئے تو اس کمرے میں ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا:

"ارے! یہ کہاں چلے گئے؟" روڈی کے منہ سے نکلا۔

ساتھ ہی ان کی نظریں غسل خانے کے دروازے پر پڑیں - وہ اندر سے بند نہیں تھا - دونوں جلدی سے غسل خانے کے دروازے پر پہنچے - اور فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ غسل خانے کا ایک دروازہ دوسرے کمرے میں بھی کھلتا ہے - گویا اب وُہ سب لوگ دُوسرے کمرے میں تھے —

"اس کا مطلب ہے - ہمیں ایک دروازہ اور توڑنا پڑے گا۔" شادا غرّایا۔

"کیا کیا جائے - مجبوری ہے۔"

"تب پھر آؤ - باہر والا دروازہ توڑنا آسان رہے گا - غُسل خانے میں ہم دوڑ کر ٹکر نہیں مار سکیں گے۔"

وُہ باہر نکلے اور ساتھ والے کمرے کے دروازے پر ٹکر بازی شروع کر دی - آخر دس منٹ بعد وہ دروازہ بھی دُوسری طرف جا گرا - وُہ لڑکھڑاتے ہوئے کمرے کے درمیان تک پہنچ گئے، سنبھل کر جو دیکھا تو اس کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا:

"یہ - یہ کیا - وُہ تو اس کمرے میں بھی نہیں ہیں۔"

انھوں نے کمرے کا جائزہ لیا اور جلد ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ چھت کے پاس ایک گیلری بنی ہوئی تھی - جو ضروری سامان رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی - اس گیلری سے ایک روشن دان

چھت میں کھولا گیا تھا — گیلری میں کھڑے ہو کر اس روشندان سے نکلنا بہت آسان تھا —

"تو — وہ — وہ چھت پر ہیں" شادا چلّایا۔

دونوں دوڑ کر باہر نکلے اور سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے، لیکن چھت پر آتے ہی دھک سے رہ گئے —

وہاں بھی ان میں سے کوئی نہیں تھا — انھوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کا جائزہ لیا — اور پھر انھیں یہ بات جاننے میں دیر نہ لگی کہ دائیں بائیں والے مکانات کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں — گویا وہ دائیں یا بائیں کسی مکان میں داخل ہو چکے تھے — اور یہ بات ان کے لیے بہت خطرناک تھی —

"روڈی — ہمیں یہاں سے نکلنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں کرنی چاہیے — ورنہ ہم پھنس جائیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے — آؤ چلیں۔"

وہ افراتفری کے عالم میں چھت سے نیچے اُترے اور پھر بیرونی دروازے کی طرف دوڑ پڑے — انھوں نے چٹخنی گرائی اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی — اور پھر وہ ساکت رہ گئے :

"اُف خدا — یہ کیا" شادا بولا۔

"انھوں نے — انھوں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے،

اب کیا ہو گا — ہم پھنس گئے — باس ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا" روڈی نے کہا۔

"ہاں! ایک تو ہم ان لوگوں کو ختم نہیں کر سکے — دوسرے پولیس کے ہتھے چڑھ جائیں گے — پولیس تو اپنی کارروائی بعد میں کرے گی — باس اپنا کام ان سے بہت پہلے دکھا جائے گا اور پولیس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو گی"

"افسوس — یہ کیا ہوا — وہ عورت ہمیں بے وقوف بنا گئی — شاید وہ بیگم جمشید تھی" روڈی حسرت زدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں — اس کے علاوہ اور کون ہو گی — اُف — مجھے اپنے اوپر بہت غصّہ آ رہا ہے — میں نے اسے فون کیوں سُننے دیا" شادا بولا —

"کیوں نہ چھت پر چڑھ کر چھلانگ لگا دیں — کیا خبر بچ جائیں"

"نہیں — نہیں بچ سکیں گے — چھت بہت اونچی ہے، یہ دروازہ بھی بہت مضبوط ہے، اندرونی دروازوں کی طرح کمزور نہیں ہے، روڈی — ہم اتنے بُرے پھنسے کبھی نہیں"

اس کے الفاظ درمیان میں رہ گئے — منہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا — اس نے بوکھلا کر روڈی کی طرف دیکھا اور پھر سرگوشی کی :

"پیچھے ہٹ آؤ روڈی — کوئی دروازہ کھول رہا ہے۔"

"ہاں — ہوشیار ہو جاؤ — خنجر ہاتھوں میں لے لو۔"

دونوں نے فوراً خنجر نکال لیے اور دروازے کے دائیں بائیں دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے —

وُہ کون ہے

"کیا مطلب — دروازہ باہر سے کیوں بند ہے؟" محمود بڑبڑایا۔

"پتا نہیں — دروازے سے پُوچھ کر بتاتا ہوں۔" فارُوق نے بھنّا کر کہا اور عین دروازے تک پہنچ گیا۔

"ایک منٹ ٹھہرو — حالات کا جائزہ لینے دو۔" محمود نے اسے ٹوکا —

"لیکن اب یہاں حالات کا جائزہ لینے والی کون سی بات رہ گئی ہے، باہر سے دروازہ بند ہونے کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے چٹخنی گرا دی اور اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا:

"اب آؤ گے بھی یا یہیں کھڑے رہو گے — اگر یہی ارادہ ہے تو پھر میں چلا اندر۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"نہیں! میں تمہارے ساتھ چلوں گا — تم مجھے بُزدلی کا طعنہ

دینے کی تیاری کر رہے ہو شاید، لیکن یاد رکھو، وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔"

"چلو نہیں آئے گا تو میں بھی اس کے بغیر گزارا کر لوں گا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

اب دونوں آگے بڑھے، فاروق نے قدم اندر رکھنا چاہا تھا کہ محمود نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

"کیوں۔ اب کیا ہوا؟"

"مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

"شکر کرو۔ کچھ نظر تو آ رہا ہے۔ بے چارے اندھوں سے پوچھو، جنھیں دال تک نظر نہیں آتی۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا۔" محمود نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

اور پھر اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور دروازے سے کئی میٹر دور برآمدے میں جا کر گرا، پھر تیزی سے مڑا اور دروازے کے ساتھ دو دشمنوں کو دیکھ کر مسکرا دیا، ساتھ ہی چلا کر بولا:

"خبردار! میرا اندازہ درست تھا۔ اندر دو دشمن موجود ہیں۔"

"ارے باپ رے۔" فاروق بوکھلا اٹھا، کیونکہ وہ اس وقت تک اندر قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے قدم پیچھے کھینچ

لیا اور پھر محمود کی طرح ایک لمبی چھلانگ لگائی۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ اب ہم ان سے دو دو باتیں کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔"

عین اسی وقت شادے نے دروازہ اندر سے بند کر لیا:

"یہ کیا کر رہے ہو شادے۔ ہمارے بارے میں پولیس کو فون کیا جا چکا ہوگا، کوئی دم میں پولیس آنے والی ہو گی۔"

"اوہ ہاں۔ واقعی۔" اس نے کہا اور پھر دروازہ کھول دیا۔

"لیکن اب تم لوگ آسانی سے نہیں جا سکو گے۔" باہر سے حوالدار محمد حسین آزاد کی آواز سنائی دی۔

"ارے! یہ تو اپنے محمد حسین آزاد صاحب ہیں۔" محمود حیران رہ گیا، کیونکہ وہ تو اسے استاد طوطے خان کے دفتر پہنچنے کی ہدایت دے کر یہاں آئے تھے اور فرزانہ کو شارگون کے پاس چھوڑ آئے تھے۔

"آپ نے ٹھیک پہچانا۔ میرے ساتھ دس بہترین نشانہ باز ہیں، یہ لوگ اگر فرار ہونا چاہیں، تو بھی نہیں ہو سکیں گے، ہاں اس صورت میں یہ ہمیں مکمل جسموں کے ساتھ ہاتھ نہیں لگیں گے۔" محمد حسین آزاد نے شوخ آواز میں کہا۔

"اوہو۔ یہ الفاظ آپ نے ادا کیے ہیں۔ انکل آزاد۔ آپ نے ضرور کسی کی شوخی چرا لی ہے۔" فاروق حیران رہ گیا۔

"ارے باپ رے، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں اور چوری

کروں گا۔ توبہ توبہ۔" محمد حسین گھبرا گیا۔

" پہلے تو ان دونوں کو قبضے میں لے لیں، پھر جلدی سے یہ بتائیں کہ فرزانہ کہاں ہے۔"

" چلو بھئی۔ ان لوگوں کو جکڑ لو، تاکہ میں ان لوگوں کو بتا سکوں کہ فرزانہ کہاں ہے۔" محمد حسین آزاد نے خوش ہو کر کہا۔

" لیکن انکل آزاد۔ یہ لوگ ان لوگوں پر قابو پاتے رہیں گے، آپ ہمیں تفصیل سُنا دیں نا۔" محمود بے چین تھا۔

" ہاں! یہ بھی ٹھیک رہے گا، شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے ایک پنتھ دو کاج والی بات کہی گئی ہے۔" محمد حسین آزاد نے کہا۔

" ہاں شاید۔ جلدی بتائیے۔ فرزانہ کہاں ہے؟"

" آپ کے فون کے دو منٹ بعد ہی فرزانہ کا فون آیا تھا۔"

" کیا کہا۔ فرزانہ کا فون آیا تھا۔" فاروق چلّا اٹھا۔ اس وقت تک سادہ لباس والے شادے اور روڈی کو قابو میں کر چکے تھے۔ اور دروازے پر بیگم جمشید باقی سب لوگوں کے ساتھ نمودار ہو چکی تھیں:

" تو ان لوگوں کو پکڑ لیا گیا ہے۔"

" اور آپ کہاں تھیں امّی جان؟" محمود نے جلدی سے پوچھا۔

" ہم تو بس اِدھر سے اُدھر ہوتے رہے ہیں اور کچھ بھی نہیں کر سکے۔" یہ کہہ کر انھوں نے تفصیل سُنا دی اور ان کے چہروں پر بے ساختہ مسکراہٹیں نمودار ہو گئیں۔

" تو آپ نے پولیس کو فون کر دیا تھا، لیکن وہ لوگ تو ابھی آئے ہی نہیں۔"

" یہ ان کی کارکردگی کی خوبی ہے۔ آ جائیں گے ٹہلتے ٹہلتے۔" بیگم جمشید نے منہ بنایا۔

اسی وقت بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور پولیس کے چہرے دکھائی دیے، لیکن اب ان کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی، لہذا انھیں رُخصت کر دیا گیا۔

" انکل۔ آپ فرزانہ کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

" ہاں! انھوں نے فون پر کہا تھا کہ طوطے خان کے دفتر کی طرف آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں سیدھا ادھر کے لیے روانہ ہو جاؤں؛ چنانچہ میں نے یہی کیا۔"

" لیکن فرزانہ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اگر اسے انکل آزاد کی ضرورت نہیں رہی تھی تو پھر وہ یہاں کیوں نہیں پہنچی اب تک۔ فارُوق۔ میں اُلجھن محسوس کر رہا ہوں۔"

" ٹھیک ہے، کر لو۔ کوئی حرج نہیں۔" فارُوق نے خوش ہو کر کہا۔

" کیا مطلب۔ کہنے کا مطلب یہ کہ کہیں فرزانہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئی اور وُہ فون اس سے زبردستی تو نہیں کرایا گیا۔"

" اوہ!" فارُوق دھک سے رہ گیا؛ پھر اس نے باہر کی طرف

دوڑ لگاتے ہوئے کہا:

"تو پھر آؤ۔"

دونوں خان رحمان کی کار میں بیٹھ کر ایک بار پھر اُستاد طوطے خان کے دفتر کی طرف اڑے جا رہے تھے:

"ابھی تک یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" محمود بڑبڑایا۔

"ابھی تک ہمیں سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی کب ملی ہے۔ واقعات کا دھارا روکے نہیں رک رہا۔ اور ہمیں اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات ہم سمجھے ہیں کہ اس خطرناک گروہ نے ہمیں، انکل خان رحمان اور پروفیسر انکل کو ایک ہی وقت میں ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ انھیں یہ منصوبہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بات ابھی ہمیں معلوم نہیں ہو سکی۔ اور میرا خیال ہے۔ اس سارے معاملے کی یہی سب سے اہم بات ہے۔" فاروق کہتا چلا گیا۔

"ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔" محمود نے سڑک پر نظر جمائے ہوئے کہا۔

"لیکن مشکل یہ ہے کہ سب سے اہم باتوں کا اور ہمارا خُدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ ہم سے کوسوں دُور بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں اور ہم ان کے پیچھے بھاگتے ہیں، بھاگنے دوڑنے کی یہ کارروائی ہمیں کہیں کا کہیں لے جاتی ہے۔ کیا خیال ہے۔" فاروق نے بےچارگی

کے عالم میں کہا۔

"خیال صرف یہ ہے کہ تم بلا ضرورت باتیں کیے بغیر رہتے نہیں۔" محمود تلملا اٹھا۔

اور آخر وہ اُستاد طوطے خان کے دفتر کے سامنے کار سے اُترے، دفتر کا دروازہ بند تھا۔ آگے بڑھ کر محمود نے دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا تو دروازہ کھل گیا:

"آؤ جلدی کرو۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔"

وہ اندھا دھند اندر داخل ہوئے اور پھر منہ کے بل گرے، کسی نے انھیں پیچھے سے ایک شاندار قسم کا دھکا دیا تھا، دوسرے ہی لمحے انھوں نے ایک چہکتی آواز سُنی:

"دیکھا! میں نے کہا تھا نا۔ دونوں اندھا دھند آئیں گے اور ہمارے جال میں پھنس جائیں گے۔"

آواز شارگون کی تھی۔ اور انھیں زہر میں بُجھی محسوس ہوئی۔

○

"ہاں! وہ کون ہے اور ہمیں کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ میرے ان دونوں سوالات کے جواب دے دو اور اپنے باس سے بھی نجات حاصل کر لو اور جیل سے بھی۔"

"لیکن مشکل یہ ہے کہ میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ باس کون ہے اور اس کے پروگراموں کے بارے میں تو ہم آج تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکے۔ وہ تو بس حکم دینا جانتا ہے۔ اور کچھ نہیں کرتا۔ کہاں رہتا ہے۔ ہم نہیں جانتے، کون ہے، ہم نہیں جانتے۔ بس اس کی آواز ضرور پہچانتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ آواز بھی بدل لیتا ہو۔" یہاں تک کہہ کر ڈی خان خاموش ہو گیا۔

"ہوں! اس سے پہلے بھی تو وہ تم سے اس قسم کے کام لیتا رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید کچھ سوچ کر بولے۔

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں، ہم تو سالہا سال سے اس کے احکامات کی تعمیل کر رہے ہیں اور خاص بات یہ بھی بتا دیں کہ ہمیں ان تمام کاموں کا معاوضہ بھی نہیں دیا جاتا۔"

"کیا مطلب۔ معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ تب پھر تم اس کے لیے کام کیوں کرتے ہو؟"

"موت کا خوف ہمیں کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے پاس ہم سب لوگوں کی مجرمانہ زندگیوں کے مکمل ریکارڈ موجود ہیں، وہ جس وقت چاہے، ہمیں قانون کے شکنجے میں دے سکتا ہے۔ خدا جانے اس نے یہ تمام ریکارڈ کس طرح حاصل کر لیا ۔۔۔ جب ہم اس کے لیے کام نہیں کرتے تھے تو اسی ریکارڈ کی

فوٹو کاپیاں ہمیں موصول ہوئی تھیں اور پھر فون پر اس کا یہ پیغام ملا تھا، آج سے تم میرے غلام ہو، میں تم سے جو کام چاہوں گا، لوں گا۔ انکار کرنے کی سزا پھانسی کا تختہ ہو گی، کیونکہ اس صورت میں میں یہ ریکارڈ پولیس کے حوالے کر دوں گا اور تمہارے جرموں کی فہرست اس قدر لمبی ہے کہ پھانسی سے کم سزا تو ہو ہی نہیں سکتی۔"

"ہوں۔ میں سمجھ گیا۔ تو وہ صرف فون پر رابطہ قائم کرتا ہے۔"

"جی ہاں۔ فون کے علاوہ وائرلیس کی قسم کا ایک آلہ بھی یہاں موجود ہے۔ اس پر بھی اس کے پیغامات موصول ہوتے ہیں، ہم اسے مخاطب نہیں کر سکتے۔"

"پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"ہم آپ کے کسی کام نہیں آ سکیں گے، کیونکہ وہ ہمارا ریکارڈ پولیس کو دے دے گا، پولیس اس ریکارڈ کو دیکھ کر ہمیں کسی صورت معاف نہیں کرے گی۔"

"لیکن میں تم لوگوں کو سرکاری گواہ بنا لوں گا، اس طرح تم بچ جاؤ گے یا کم از کم پھانسی سے بچ جاؤ گے۔"

"افسوس! ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ آپ کو بتائیں کیا۔"

"اچھا ٹھیک ہے — میں تم لوگوں کو حوالات بھجوا دیتا ہوں — بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"یہ — اور بھی اچھا رہے گا۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"کیوں! اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے۔"

"کک — کچھ نہیں۔" ڈی خان ہکلایا۔

انسپکٹر جمشید چند لمحے تک اسے گھورتے رہے اور پھر کچھ سوچ کر اس علاقے کے پولیس انسپکٹر کو فون کر دیا، پولیس کے آنے میں دیر نہ لگی —

"اوہو — انسپکٹر کبیر ہیں — میں آپ کو پہچانتا ہوں — ان لوگوں کو لے جائیے۔"

"جی بہتر۔" پولیس انسپکٹر کبیر نے کہا اور وہ ان سب کو گرفتار کر کے لے گئے — اب انھوں نے اس عمارت کی تلاشی لی، وائرلیس نما آلے کے سوا اور کوئی چیز ہاتھ نہ لگی — انھوں نے آلہ قبضے میں لیا اور وہاں سے خالو کے فلیٹ پر آئے — اکرام اس وقت تک لاش اُٹھوا چکا تھا — خالو کی جیب سے انھیں کوئی کارڈ نہ ملا —

خان رحمان کے گھر فون کر کے حالات معلوم کیے اور پھر حالات سنتے ہی خان رحمان کے ساتھ اُستاد طوطے خان کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے، ابھی تک اُستاد طوطے خان کاروں

کا رجسٹر لے کر بھی حاضر نہیں ہوا تھا۔ راستے میں اُنھوں نے ایک فون بھی کیا — اور پھر طوطے خان کے دفتر کے سامنے پہنچ کر جیپ سے اُترے — خان رحمان کی کار باہر کھڑی نظر آئی —

"اس کا مطلب ہے — محمود، فاروق اور فرزانہ یہیں ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"لیکن جمشید — عمارت میں تو موت کا سناٹا طاری ہے۔" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"آؤ — دیکھتے ہیں، کیا ماجرا ہے۔"

وُہ احتیاط سے اندر داخل ہوئے، لیکن کوئی ہلکی سی آواز بھی سنائی نہ دی —

"شاید! یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اوہ — یہ — یہ جوتا۔" خان رحمان خوف زدہ آواز میں بولے۔

انسپکٹر جمشید نے بھی فرش پر پڑا فاروق کا ایک جوتا دیکھ لیا۔

"ایک جوتے کا ہونا خطرناک بات ہے — آؤ جلدی کرو۔"

اب وُہ تیزی سے اندر داخل ہوئے اور ایک ایک کر کے سب کمرے دیکھ ڈالے، لیکن پوری عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی — اندر کوئی بھی نہیں تھا؛ البتہ فاروق کا جوتا اور دفتر والے کمرے سے ملنے والے محمود کے رومال سے یہ بات

ظاہر ہوتی تھی کہ وہ لوگ یہاں تھوڑی دیر پہلے موجود ضرور تھے ۔ اتفاق کی بات کہ رومال بھی پہلے خان رحمان کو نظر آیا تھا ۔

"خان رحمان! رومال تم نے کہاں سے اٹھایا تھا۔"

"فرش پر پڑا تھا۔"

"ہوں ۔ جوتا بھی فرش پر پایا گیا ۔ اور رومال بھی ۔ لیکن یہ لوگ اتنے سیدھے نہیں کہ دو ایسی چیزیں اس لاپروائی سے چھوڑ جائیں ۔ اس کا مطلب جانتے ہو خان رحمان۔" انسپکٹر جمشید عجیب سے انداز میں مسکرائے۔

"نن ۔ نہیں ۔ میں اس کا مطلب نہیں جانتا۔" خان رحمان ہکلائے ۔

"تو پھر سنو ۔ ہم پھنس چکے ہیں۔"

"پھنس چکے ہیں ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو جمشید، مجھے تو یہاں پھنسنے والی بات دور دور تک نظر نہیں آتی ۔ بھئی دفتر کا دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے ہیں ۔ باہر نکل جانا بھلا کیا مشکل ہے۔"

"اچھا ۔ یہ بات ہے ۔ تو پھر جاؤ ۔ ذرا دروازے تک چکر لگا آؤ۔"

"اچھی بات ہے۔" انھوں نے حیرت زدہ انداز میں کہا اور

تیز تیز قدم اٹھاتے کمرے سے باہر نکل گئے ۔ ایک منٹ بعد ہی وہ واپس آئے ۔ اب ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ۔

"کیوں! میرا اندازہ درست ہے نا۔"

"ہاں! تمام دروازے اور کھڑکیاں بند ہیں، اس کا مطلب ہے، ہم مکان میں گھر چکے ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں ۔ آؤ پہلے اس عمارت کا جائزہ لے لیں، اس کے بعد یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کریں گے۔"

"لیکن جمشید ۔ ہم کوئی تدبیر نہیں کر سکیں گے ۔ میں امکانات کا جائزہ لے چکا ہوں۔" خان رحمان کا لہجہ فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"وہ کیسے؟"

"دروازے بہت مضبوط ہیں، کھڑکیوں میں اندر کی طرف سلاخیں ہیں ۔ زینے کا دروازہ بھی بند ہے ۔ گویا ہم چھت پر بھی نہیں جا سکتے۔"

"لیکن خان رحمان! تم نے شاید اس طرف دھیان نہیں دیا کہ تھوڑی دیر پہلے بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا ۔ ہمارے اندر داخل ہونے کے بعد کسی نے بند کیا ہے ۔ گویا ہمیں بند کرنے والے بھی یہیں کہیں موجود ہیں اور شاید ہماری بے بسی کا دل ہی دل میں مذاق اڑا رہے ہیں ۔ تمھاری کار باہر

موجود ہے۔ یعنی ان کا کہیں جانے کا فی الحال پروگرام نہیں ہے، اگر پروگرام ہوتا تو پھر وُہ ہمارے جانے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دروازہ باہر سے بند کرنے کے بعد چلے گئے ہوں۔"

"نہیں! ہم نے ابھی تک کار سٹارٹ ہونے کی آواز نہیں سُنی۔"

اب انھوں نے عمارت کا جائزہ لیا۔ لیکن یہاں کاروں کے کاغذات کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کی خرید اور فروخت کے کاغذات کرائے پر دینے کے کاغذات۔ مرمت کے اخراجات کے کاغذات۔ اور بس —

عین اسی وقت خان رحمان کی نظر فون پر پڑی:

"جمشید۔ یہاں فون موجود ہے۔" خان رحمان نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"ہاں! میں دیکھ چکا ہوں، لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس کے تار کاٹ دیے گئے ہوں گے۔"

"تجربہ کر لینے میں کیا حرج ہے۔"

انسپکٹر جمشید فون کی طرف بڑھے ہی تھے کہ انھیں بہت زور سی کھانسی آئی، یہی حال خان رحمان کا ہوا:

"اوہ۔ اوہ۔ خان رحمان۔ مارے گئے۔ انھوں نے۔ انھوں نے۔"

انسپکٹر جمشید کی آواز ڈوب گئی۔ خان رحمان تو ان سے پہلے ہی بے ہوش ہو کر گر چکے تھے۔ کمرے میں گھس آنے والی گیس حد درجے تیز تھی —

محاورات کا قتل

آنکھ کھلی تو محمود ، فاروق اور فرزانہ نے انسپکٹر جمشید کی آواز سُنی :

" تم لوگ شاید یہاں ہم سے پہلے ہی پہنچ چکے ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" جی ہاں۔ آپ کا استقبال جو کرنا تھا۔" فاروق بولا۔

" چلو خیر۔ پروفیسر صاحب اور باقی لوگ تو محفوظ رہے۔" خان رحمان بولے۔

" بھئی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ، ہم لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔" پروفیسر داؤد کی آواز سنائی دی۔

" ارے۔" وہ اچھل پڑے۔

مڑ کر دیکھا تو فرش پر سب ہی موجود تھے۔ کوئی لیٹا تھا، کوئی بیٹھا تھا اور کوئی نیم دراز تھا۔

"کمال ہے۔ میں نے جب گھر فون کیا تھا ، اس وقت تو

محمد حسین آزاد نے بتایا تھا کہ یہاں سب خیریت ہے۔"

" جی ہاں ! اس وقت واقعی وہاں خیریت تھی، لیکن پھر آپ کا فون ملا۔ آپ نے پروفیسر صاحب کو اُستاد طوطے خان کے دفتر میں بلایا تھا۔ چنانچہ میں انھیں ساتھ لے کر وہاں پہنچا اور پھر نہ جانے کس طرح ہم دونوں بے ہوش ہو گئے۔"

" یہ کوئی نئی بات نہیں ، بے ہوش تو ہم بھی نہ جانے کس طرح ہو گئے تھے۔" فاروق نے منہ بنایا، محمد حسین آزاد نے اسے گھور کر دیکھا۔

" مطلب یہ ہوا کہ اب ہم یہاں کسی کے قیدی ہیں، لیکن کیوں، انھیں قید کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ لوگ تو ہمیں قتل کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ سر توڑ کوشش کے بعد اگر انھیں اس کا موقع ملا تو پھر انھوں نے ایسا کیوں نہ کیا۔ ہمیں صرف قید کیوں کر دیا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" واقعی۔ حیران کن بات ہے۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

" پہلے تو ہم ایک دوسرے سے یہاں تک آنے کی تفصیل سُن لیں۔ بھئی فرزانہ پہلے تم سناؤ۔"

" میری کہانی بہت عجیب ہے۔" فرزانہ نے سرد آہ بھری۔

" خیر کوئی بات نہیں ، ہم صبر کر کے سُن لیں گے۔" فاروق مسکرایا۔

"محمود اور فاروق شارگون کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر انکل کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے ۔ مسٹر طوطے خان بھی انکل آزاد کے آنے تک میرے پاس ٹھہرے رہے ، پھر دروازے پر دستک ہوئی اور مسٹر طوطے خان دروازہ کھولنے کے لیے چلے گئے ۔ مجھے حیرت تو ہوئی تھی کہ اس قدر جلد پولیس کس طرح آگئی ، لیکن کچھ نہ کہہ سکی ۔ اچانک میں نے کسی کے گرنے کی آواز سُنی ۔ بوکھلا کر دروازے کی طرف گئی تو کوئی چیز میرے سر پر زور سے لگی اور میں بے ہوش ہو گئی ۔"

"اس کا مطلب ہے ۔ تمھارے بے ہوش ہونے کے بعد تمھیں یہاں پہنچا دیا گیا ۔ بے چارے طوطے خان وہیں رہ گئے ۔"

"جی نہیں ۔ میں بھی یہاں ہوں ۔" انھوں نے طوطے خان کی آواز سُنی ۔

"ارے !" وہ سب کے سب چونک اٹھے ۔ مُڑ کر دیکھا تو طوطے خان سب سے الگ تھلگ پڑے نظر آئے ۔

"یہ بے چارے ہمارے ساتھ بلا وجہ مارے گئے ۔"

"کک ۔ کیا مطلب ۔ مارے گئے ۔" طوطے خان نے ہکلا کر کہا ۔

"ہاں ! ظاہر ہے ۔ ہم لوگوں کو یہاں کسی نیک ارادے سے تو لایا نہیں گیا ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

"اُف خدا ۔ یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ۔"

"قصور آپ کا اپنا ہے ۔ آپ نے مجرمانہ ذہن کے لوگوں کو اپنی کاریں دے کیوں رکھی تھیں ۔"

"ہوں ! مجھے کیا معلوم تھا ۔ وہ جرائم پیشہ ہیں ۔" طوطے خان نے حسرت زدہ لہجے میں کہا ۔

"پھر وہی اُلجھن مجھے گھیرے لے رہی ہے ۔ آخر ان لوگوں نے ہمیں یہاں قید کیوں کر دیا ۔ ان کا پروگرام تو ختم کر دینے کا تھا ۔" فرزانہ بڑبڑائی ۔

"آپ لوگ بھی عجیب ہیں ۔ زندہ چھوڑ دیے جانے پر خوش تو ہو نہیں رہے ۔ حیران ہو رہے ہیں ۔"

"اس لیے کہ خوش ہونے کی نسبت حیران ہونا صحت کے لیے زیادہ مفید ہے ۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا ۔

"تو پھر تم نے یہ جملہ خوش ہو کر کیوں کہا ۔ حیران ہو کر کہتے نا ۔" فرزانہ جل بھُن کر بولی ۔

"بھئی کم از کم اس قید خانے میں تو کاٹ کھانے کو نہ دوڑو ۔" فاروق چہکا ۔

"ہوشیار ۔ خبردار ۔" محمود بلند آواز میں بولا ۔

"کس چیز سے خبردار کر رہے ہو بھئی ۔" خان رحمان حیران ہو کر بولے ۔

"اس چیز سے کہ فاروق اب شروع ہونے کے لیے پَر تول

رہا ہے۔"

"اور یہ میرے پُر کاٹ دینے پر تُل گیا ہے۔" فاروق نے گویا اعلان کیا۔

"قید خانے کی فضا تو شاید انھیں راس آ گئی۔ جبھی تو دھڑا دھڑ محاورے اُگل رہے ہیں۔" پروفیسر داؤد حیران ہو کر بولے۔

"تو پھر۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے محاروں کا گلا گھونٹ دیں۔" فرزانہ ہنسی۔

"نہ نہ۔ یہ محاورات کا قتل ہو گا۔" خان رحمان گھبرا گئے۔

"ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ لوگوں کو یہاں قید ہونے کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہے۔" طوطے خان نے بھنّائے ہوئے انداز میں کہا۔

"افسوس کر کے بھی ہم کیا کر لیں گے۔ اس قید خانے کے دروازے آج کے نازک اندام دروازے نہیں ہیں، میں نے ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے یہی جائزہ لیا تھا، بلکہ میں تو سب کے ہوش میں آنے سے پہلے دروازے کھولنے کی کوشش بھی کر چکا ہوں۔"

"شکریہ ابا جان۔ آپ کو ہمارا کتنا خیال ہے۔" فاروق نے جذباتی آواز میں کہا۔

"اس میں خیال کی کیا بات۔ یہ کوشش تو میں نے غیرارادی

طور پر کی تھی۔" وہ بولے۔

"لل۔ لیکن ابا جان۔ آپ۔" محمود کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کی آنکھیں سوالیہ انداز میں ان کی طرف اُٹھ گئیں۔

"ہاں: میں سمجھ گیا، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ خیر۔ جواب یہ ہے کہ میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔"

"کیا مطلب۔ کیا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" خان رحمان حیران رہ گئے۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہہ سکتے، کمرے کا دروازہ کھلا اور لمبے قد کا ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ انھوں نے دیکھا۔ وہ شارگون تھا:

"ارے۔ مسٹر شارگون آپ۔ آپ کی ٹانگ کس طرح ٹھیک ہو گئی۔"

"ایک ڈاکٹر کو پستول دکھا کر پٹی کرائی ہے۔ ٹانکے بھی لگوانے پڑے۔ خیر کوئی بات نہیں، میں انتقام لے لوں گا۔" اس نے بھنّا کر کہا۔

"کس بات کا انتقام لے لیں گے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"چاقو کے اس زخم کا۔ یہ دیکھو، اب چاقو میرے قبضے میں ہے۔" اس نے دایاں ہاتھ سب کے آگے کر دیا، اس میں محمود کا کھلا چاقو تھا۔

"تو کیا آپ نے ہمیں صرف انتقام لینے کے لیے یہاں قید کیا ہے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تب پھر ہمیں قید کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ ہمارے بارے میں تمہیں حکم ملا ہوا ہے۔"

"ہاں! ملا ہوا تھا، لیکن اس پروگرام کے مطابق ہم تم لوگوں کو ختم نہیں کر سکے تھے؛ چنانچہ یہاں لا کر قید کر دیا۔ اب جب تک باس کا نیا حکم نہ ملے۔ ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے، جونہی نیا حکم ملا، اس پر عمل شروع کر دیا جائے گا۔"

"تو نیا حکم حاصل کر لو۔"

"باس ہم سے رابطہ قائم نہیں کر رہا ـــــ وہ نہ جانے کہاں مصروف ہے۔ مطلب یہ کہ جب تک حکم نہیں ملے گا، تم لوگوں کو یہاں قید رکھا جائے گا۔"

"تو کیا ہم اُستاد طوطے خان کے دفتر میں ہی قید ہیں؟"

"ارے نہیں، وہ جگہ تو بہت آباد جگہ ہے۔ وہاں تو تم لوگ فوراً ہی دیکھ لیے جاتے، اس وقت تم ایک سنسان جگہ پر موجود ہو، یہاں کوئی تمہاری مدد کے لیے نہیں آ سکے گا۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"کوئی بات نہیں، ہم اپنی مدد آپ کرنا جانتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ٹھیک۔ اب میں چلتا ہوں۔ یہی بتانے آیا تھا کہ پُرسکون رہو ہلڑ بازی سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اور ہاں۔ تم لوگ شوق سے اپنی مدد آپ کر سکتے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"تو پھر مہربانی فرما کر اپنی مدد آپ کا آلہ دیتے جائیں۔"

"اپنی مدد آپ کا آلہ۔ کیا مطلب؟"

"یہ چاقو ہمیں دے دیں۔"

"افسوس! یہ تم لوگوں کو نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بہت خطرناک ہے، دوسرے یہ کہ اس کی مدد سے مجھے تم میں سے ہی ایک کی پنڈلی کاٹنی ہے۔"

"ارے باپ رے۔ اتنا خوف ناک پروگرام۔" فاروق بوکھلا اٹھا۔

"اور کیا اس پروگرام پر اس صورت میں بھی عمل کرو گے۔ جب کہ باس ایسا کرنے کی اجازت نہ دے۔"

"اس سے ایسی بات پوچھتا ہی کون ہے۔ اس کی طرف سے تو ابھی تم لوگوں کو ہلاک کرنے کا حکم ملے گا۔ اب تم لوگ میرے قبضے میں ہو، اب میری مرضی ہے کہ تمہیں موت کے گھاٹ کس طرح اتاروں۔"

"ہاں واقعی۔ بات تو ٹھیک ہے، لیکن ہم تمہیں اس قابل [illegible] کیا ہم میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ اسی وقت تم پر [illegible]

"یہی تو بات ہے — تم لوگ ایسا نہیں کر سکو گے۔ ورنہ میں یہاں اتنی بے فکری سے تو داخل نہیں ہو سکتا تھا۔"

"کیوں نہیں کر سکیں گے۔ ذرا وضاحت کر دو۔"

"اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے تھوڑی سی گیس اس کمرے میں داخل کر دی تھی۔ اس گیس نے تم لوگوں کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ مجھ پر حملہ کر سکو۔ چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی محمود نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی، لیکن تھوڑی سی حرکت کر کے رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر جوڑ سے ٹیس سی اٹھی ہو۔

"ارے باپ رے — یہ — یہ مجھے کیا ہو گیا۔"

"اور گیس کا اثر تم پر کیوں نہیں ہوا مسٹر شارگون؟"

"میں نے اس گیس کا توڑ، ایک دوا کھا رکھی ہے۔"

"تمہارا باس ہمیں کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"مجھے نہیں معلوم — ویسے کوئی بہت اہم وجہ ہے، کیونکہ یہ منصوبہ بہت جلدی میں بنایا گیا تھا۔"

"بھائی شارگون — یہاں کچھ کھانے پینے کو بھی ملے گا یا بھوکے ہی رہنا ہو گا۔"

"جن لوگوں کو مارنا ہمارا مقصد ہے، انہیں کھانا دے کر کیا کریں گے۔" اس نے کہا۔

"یہ — یہ تو ظلم ہو گا جناب — فرض کیا تین چار دن تک باس آپ سے بات نہیں کرتا۔"

"تو کیا ہوا — تین چار دن گزار لوں گا۔"

"اور ہم — ہم کیا کریں گے۔" پروفیسر داؤد بوکھلا اٹھے۔ بھوک کے خیال نے انہیں اسی وقت آ گھیرا تھا، ان کی یہ حالت دیکھ کر انسپکٹر جمشید مسکرا دیے، دراصل پروفیسر داؤد بھوک کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔

"صبر!"

اس نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا:

"لیجیے حاضرین — اب بھوک برداشت کریں اور پیاس بھی۔ ان کے علاوہ صبر پر گزارا کریں۔" فاروق بولا۔

"اور مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ اس بار ہمارے ساتھ حوالدار محمد حسین آزاد صاحب بھی پھنس گئے۔ جب کہ انہیں پھنسنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور تو اور بے چارے استاد طوطے خان بھی مارے گئے — اب ان کا کیا تعلق تھا اس معاملے سے — ان کی کاریں ضرور اس معاملے میں استعمال کی گئی ہیں، لیکن اس میں ان کا قصور نہیں تھا — ہمیں نہ جانے کیا کہہ رہے ہوں گے دل ہی دل میں۔"

"نہیں بھئی۔ میں کچھ نہیں کہہ رہا۔ اگر میری قسمت میں آپ لوگوں کے ساتھ مارا جانا لکھا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور میں ہی کیا۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"اُستاد صاحب۔ مایوسی کی باتیں تو نہ کریں۔ ہمارے منہ سے اب تک کوئی مایوسی کی بات سُنی ہے آپ نے۔" محمود نے نرم آواز میں کہا۔

"نن۔ نہیں۔ اس بات پر تو خیر مجھے بہت حیرت ہے۔"

"آپ کو ہی کیا۔ اچھے اچھوں کو حیرت ہے، لیکن بات صرف اتنی سی ہے کہ ہمارا ایمان ہے۔ مایوسی گناہ ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"اوہ ہاں! یہ تو ہے۔"

"بھئی۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب ضرور کرنا پڑے گی۔ ورنہ بے موت مارے جائیں گے۔ شارگون جب بھی آئے گا۔ گیس چھوڑ کر آئے گا اور ہم اس کا مقابلہ کسی طرح بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"جو آپ فرمائیں۔ کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"پہلے تو ہل جل کر دیکھ لو۔ حرکت کرنے کے قابل ہو گئے ہو یا نہیں، کم از کم میں تو چلنے پھرنے قابل ہو گیا ہوں۔"

انھوں نے اپنے جسموں کو حرکت دی۔ اور آخر محمود نے

اعلان کیا:

"ٹھیک ہے ابا جان۔ ہم چل پھر سکتے ہیں۔"

"تو پھر مجھے اس روشندان تک پہنچا دو۔ دوسری طرف میں خود کود جاؤں گا۔"

"جی کیا مطلب۔ ہم پہنچا دیں۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں۔ وہ تم ایک منارہ سا بنا لیا کرتے ہو نا ایسے موقعوں پر۔ میں اس پر چڑھ کر روشن دان تک پہنچ سکتا ہوں۔"

"لیکن آپ دوسری طرف کس طرح کودیں گے؟"

"جیسے بھی ہوا۔ کودنا ہی ہوگا، کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اگر ہم نے یہ کوشش نہ کی تو پھر ہم سب شارگون کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ کیونکہ وُہ کم بخت پہلے گیس کمرے میں چھوڑے گا، اس کے بعد اندر آئے گا۔ وُہ ہم سے خوفزدہ ہے۔ ہمیں اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لیے پوری طرح انتظام کر کے آئے گا۔ تو پھر کیوں نہ ہم ہی کچھ کر گزریں۔ ورنہ موت کے جال میں تو پھنس ہی چکے ہیں۔"

"ہوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن شاید ابھی ہم سب کے جسم اچھی طرح حرکت کرنے کے قابل نہیں ہو سکے۔ کم از کم میں تو یہی محسوس کر رہا ہوں۔" محمود نے کہا۔

"خان رحمان۔ تمھارا کیا حال ہے؟"

"بس۔ درمیانہ ہی حال ہے۔" انھوں نے منہ بنایا۔

"خیر ہم کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں۔"

"منارے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔" حوالدار محمد حسین آزاد بول اُٹھا۔

"ابھی جب بنے گا تو سمجھ میں آجائے گی۔" فارُوق بولا۔

آخر تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"خان رحمان تم، استاد طوطے خان اور آزاد کھڑے ہو جائیں۔ روشندان کے نیچے تینوں ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ لیں۔"

"اچھی بات ہے۔" خان رحمان بولے اور اُٹھ کھڑے ہوئے، لیکن لڑکھڑا گئے۔

"اوہو۔ شاید گیس کا اثر ابھی اچھی طرح دُور نہیں ہوا۔"

"کوئی بات نہیں خان رحمان۔ ہمت کرو۔ اب ہم اور وقت ضائع نہیں کر سکتے۔"

محمد حسین آزاد بھی اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے روشن دان کے نیچے پہنچ گیا۔ اُستاد طوطے خان بھی حیرت زدہ انداز میں اٹھا اور پھر روشندان تک پہنچ گیا۔ انسپکٹر جمشید کی آنکھوں میں اس وقت ایک پُر جوش سی چمک نظر آ رہی تھی۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"بس ٹھیک ہے، اب بیٹھ جائیں۔ چلو محمود، فاروق۔ ان کے کندھوں پر سوار ہو جاؤ۔"

محمود اور فارُوق نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور ان تینوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ایک دوسرے کے کندھوں کو پکڑ لیا۔ اب انسپکٹر جمشید آگے بڑھے اور ان دونوں کے کندھوں پر ایک ایک پیر رکھ کر بیٹھ گئے:

"خان رحمان۔ آپ تینوں آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑے ہوں۔ اگر کمزوری محسوس ہو تو بتا دیں۔ پھر ہم یہ کوشش کچھ دیر بعد کر لیں گے۔"

انھوں نے اٹھنا شروع کیا۔ آخر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد محمود اور فاروق نے اٹھنا شروع کیا، جب وُہ بالکل سیدھے ہو گئے تو انسپکٹر جمشید اُٹھے اور اپنے ہاتھ بلند کر دیے۔ ان کے ہاتھ آسانی سے روشندان تک پہنچ گئے، یہ کافی بڑا تھا۔ درمیان میں ایک سُلاخ بھی لگی تھی۔ انھوں نے سُلاخ کو تھام لیا اور پیر کندھوں پر سے اُٹھا لیے۔

"بس بھئی۔ آپ لوگ ایک دوسرے پر سے اُتر جائیں۔" وُہ بولے اور اپنا جسم اوپر اٹھانے لگے۔ یہاں تک کہ روشندان میں داخل ہو گئے۔ اب سُلاخ کے نیچے سے گزر کر دوسری طرف لٹک گئے اور بولے:

"میں چھلانگ لگا رہا ہوں — دُعا کرنا — ہاتھ پیر نہ ٹوٹیں۔"
"آمین!" انھوں نے ایک ساتھ کہا اور انسپکٹر جمشید نے سلاخ چھوڑ دی —

میں یہ گیا

دھم کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی — ان کے دل زور زور سے دھڑکے — سانس سینوں میں اٹک اٹک گئے — آخر آدھ منٹ بعد انھوں نے چٹخنی گرنے کی آواز سُنی اور پھر دروازہ کُھل گیا — انسپکٹر جمشید کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ناچ رہی تھی:

"میں محفوظ رہا، خُدا کا شکر ہے۔"

"آئیے اب چلیں — ابھی تو بیرونی دروازہ بھی بند ہوگا۔" محمود نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! لیکن فکر کی کوئی بات نہیں — اب ہم کچھ نہ کچھ کر ہی گزریں گے۔"

کمرے سے باہر انھیں ایک صحن نظر آیا، اس کے چاروں طرف کمرے تھے، ان کمروں میں سے ایک میں وہ بند کیے گئے تھے — دائیں طرف بیرونی دروازہ نظر آیا اور بائیں طرف اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں —

دروازہ باہر سے بند تھا - لہذا وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے،
لیکن یہاں ایک بڑا سا تالا ان کا منہ چڑا رہا تھا:

"گویا ہم چھت پر نہیں جا سکتے۔" پروفیسر داؤد نے ڈوبتے
دل کے ساتھ کہا۔

"فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں - اب ہم یہاں سے
آزاد ہو جائیں گے - ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ آزادی حاصل
کرنے میں کچھ دیر لگ جائے - شارگون کے فرشتوں کو بھی یہ
بات معلوم نہیں کہ ہم اس کمرے سے نکل چکے ہیں - لہذا وہ
بے فکر ہو کر اندر داخل ہو گا اور ہم اس پر ٹوٹ پڑیں
گے - آن کی آن میں وہ چت ہو گا۔"

"ہوں - بات تو ٹھیک ہے جمشید - لیکن یہ بھی تو سوچو کہ
وہ نہ جانے کب یہاں آئے۔" خان رحمان بولے۔

"ہاں ٹھیک ہے، لیکن ہم اور کر ہی کیا سکتے ہیں - یہ
ایک پرانی عمارت ہے اور شاید ہے بھی بالکل غیر آباد علاقے میں،
ورنہ ہم دروازہ پیٹ پیٹ کر گزرنے والوں کو اپنی طرف
متوجہ کر سکتے تھے - دروازے اس کے بہت مضبوط ہیں - ہم
توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے - ہم صبر کر لیتے ہیں - کم از کم پہلے والی
صورت نہیں ہے - اب شارگون ہمیں گیس کے ذریعے بے کار

تو نہیں کر سکے گا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی ہاں انکل - صبر کا پھل یوں بھی میٹھا ہوتا ہے۔" فاروق
مسکرایا -

"بھئی ایسی باتیں نہ کرو، مجھے پہلے ہی بھوک لگی ہے۔"

"حیرت ہے، ابھی تو رات ختم نہیں ہوئی - صبح سے پہلے
ہی آپ کو بھوک لگ گئی۔" فرزانہ بولی۔

"آرام سے سونے کی بجائے بھاگ دوڑ جو کرنا پڑی ہے۔"
انھوں نے کہا۔

"اوہ ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔"

وہ انتظار کرنے لگے، پھر انسپکٹر جمشید کو کچھ خیال آیا:

"کیوں نہ میں اس عمارت کے باقی کمروں کی تلاشی لے لوں،
شاید کوئی کام کی چیز مل جائے۔"

"ٹھیک ہے لے لو، لیکن ہم دروازے پر ہی موجود رہیں
گے۔" خان رحمان نے کہا۔

"صرف محمود، فاروق اور فرزانہ میرے ساتھ آجائیں - باقی لوگ
یہیں ٹھہریں۔" انھوں نے کہا۔

چاروں پھر صحن کی طرف بڑھے -

انھوں نے مکان کا بغور جائزہ لیا، صحن کے چاروں طرف
بنے کمروں کی تلاشی لی، لیکن وہاں سے کسی قسم کی کوئی کام کی

چیز نہ مل سکی۔ شاید اس عمارت کو صرف انھیں قید کرنے
کے لیے کام میں لایا گیا تھا۔ یہ ان لوگوں کا کوئی باقاعدہ
ٹھکانا نہیں تھا، اگر باقاعدہ ٹھکانا ہوتا تو ضروریات کا سامان
ضرور موجود ہوتا۔ تھک ہار کر وہ پھر دروازے پر آ گئے:

"معلوم ہوتا ہے، کچھ نہیں ملا۔" خان رحمان مسکرائے۔

"ہاں! یہ جگہ صرف ہمیں قید کرنے کے لیے حاصل کی گئی ہے۔"

اسی وقت باہر قدموں کی آواز سنائی دی، وہ خاموش ہو
گئے۔ دل دھک کرنے لگے۔ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر
دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تھے، آخر دروازہ کھلا
اور شارگون گنگناتا ہوا اندر داخل ہوا۔ چند قدم آگے بڑھا تھا
کہ انسپکٹر جمشید کی آواز گونجی:

"ہیلو شارگون!"

شارگون بری طرح اچھلا، مڑا اور پھر اس کی آنکھیں حیرت
اور خوف کی زیادتی سے پھٹ پڑیں:

"یہ۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

"کم از کم تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے، اس بات کی میں
گارنٹی دیتا ہوں، اور یہ گارنٹی سال دو سال کی نہیں، چند
گھنٹوں کی ہے۔" فاروق کی شوخ آواز گونجی۔

"تم۔ تت۔ تم بند کمرے سے کس طرح نکلے؟" وہ ہکلایا۔

"کالے علم کے ذریعے۔ اس علم کے ذریعے ہم نے اپنے آپ کو
مکھیوں میں تبدیل کیا اور پھر روشندان کے ذریعے باہر نکل آئے۔"
فاروق نے فوراً کہا۔

"م۔ میں نہیں مانتا۔"

"کس چیز کو۔ کالے علم کو یا ہمارے کمرے سے نکل آنے کو،
اگر یہی بات ہے تو کمرے میں جا کر دیکھ لو، وہاں ہم نہیں
ملیں گے۔ اور اگر مل گئے تو ہم جھوٹے۔" فاروق مسکرایا۔

"فاروق۔ اوٹ پٹانگ باتوں سے پرہیز کرو۔" انسپکٹر جمشید
بھنا اٹھے۔

"جی بہتر! اب میں مکمل پرہیز کروں گا۔ یوں بھی پرہیز
علاج سے بہتر ہے۔ ہاں تو مسٹر شارگون بات صرف اتنی سی ہے
کہ ہم نے اپنی عقل کو استعمال کیا اور کمرے سے نکل آئے۔"

"دھت تیرے کی۔ یہ اوٹ پٹانگ باتوں سے باز آئے ہو
تم۔"

"ارے۔ تو کیا یہ بات بھی۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا،
لیکن جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"تم ہمیں یہاں بند کر کے کہاں گئے تھے مسٹر شارگون؟"

"شہر۔ باقی لوگوں سے مشورہ کرنے۔ کہ تم لوگوں کا کیا کیا
جائے۔ دراصل ہم لوگ صرف اور صرف باس کے اشاروں پر

کام کرتے ہیں۔ اپنی عقل کام میں نہیں لاتے۔ ہمیں حکم بھی یہی ہے، تم لوگوں کے بارے میں جو منصوبہ تھا، وہ ناکام ہو گیا تھا، پھر ہم تمہیں قید کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جو پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ اس لیے باس کی منظوری کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کی جا سکی۔ اب ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم باس سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے۔ اس نے ہمیں اس کا طریقہ نہیں بتا رکھا۔ بس جب اسے ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ ہم سے بذریعہ فون بات کر لیتا ہے، یا اس آلے پر مخاطب کرتا ہے۔ وہ اپنے خیال میں سمجھے بیٹھا ہوگا کہ ہم نے تم لوگوں کو پروگرام کے مطابق ختم کر دیا۔"

"خیر۔ اب پروگرام دوسرا شروع ہو چکا ہے۔ اب ہم تمہاری قید میں نہیں رہے، تم ہمارے قیدی بننے والے ہو۔ چلو ہمارے ساتھ۔ ہمیں بھی تو میزبانی کے فرائض انجام دینے ہوں گے۔"

"سوری! ایم آئی پی کے کارکن سرکاری اہل کاروں کے ساتھ نہیں جایا کرتے۔ وہ اپنی جان تو دے دیتے ہیں۔ قانون کے محافظوں کے ہتھے نہیں چڑھتے، کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ وہاں کیا سلوک ہوتا ہے۔ لہذا میں یہ گیا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ اپنا بایاں ہاتھ منہ کی طرف لے گیا۔ فوری طور پر انھوں نے دیکھا، اس کے بائیں ہاتھ کی

انگلی میں ایک انگوٹھی تھی۔ گویا وہ زہر کھانے جا رہا تھا۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید نے بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور اس سے جا ٹکرائے۔

اسے بہت زور دار دھکا لگا۔ دونوں فرش پر ڈھیر ہو گئے، انسپکٹر جمشید نے اپنا ہاتھ اس کے انگوٹھی والے ہاتھ پر جما دیا اور بولے:

"خان رحمان۔ انگوٹھی اس کے ہاتھ سے اتار لو۔"

خان رحمان آگے بڑھے ہی تھے کہ شارگون مچھلی کی طرح تڑپا اور انسپکٹر جمشید کے نیچے سے نکل گیا۔ انگوٹھی والا ہاتھ بھی ان کی گرفت سے نکل گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خان رحمان سے ٹکرایا۔ بھنّاہٹ کے عالم میں اس نے انگوٹھی والا ہاتھ خان رحمان کے منہ پر دے مارا، خان رحمان اگر اس وقت بجلی کی سی تیزی سے نیچے نہ بیٹھ جاتے تو انگوٹھی کا شکار ہو گئے تھے۔ بیٹھتے ہی انھوں نے اس کی ٹانگوں پر اپنے پاؤں دے مارے۔ اتنے میں انسپکٹر جمشید آگے بڑھ چکے تھے۔ انھوں نے اس کے بائیں ہاتھ کی کلائی پر اپنے دائیں ہاتھ کی ہڈی دے ماری۔ یہ وار اس قدر کاری تھا کہ شارگون کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا، اس میں اتنی بھی سکت نہ رہی کہ انگوٹھی والا ہاتھ منہ تک لے جا سکتا۔ انسپکٹر

جمشید نے آگے بڑھ کر انگوٹھی اس کے ہاتھ سے نکال لی اور
بولے:
"بدقسمتی سے تم قانون کے ہتھے چڑھ چکے ہو۔ تمھاری خودکُشی
کی کوشش ناکام بنا دی گئی ہے، اب کیا خیال ہے؟"
"میں حوالات کی سلاخوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو ختم کر لوں
گا۔"
"اور میں تمھیں یہ کوشش بھی نہیں کرنے دوں گا۔" انسپکٹر جمشید
بولے، پھر ان کی طرف مڑے:
"چلو بھئی۔ باندھ لو اسے۔"
محمود، فاروق اور فرزانہ آگے بڑھے اور اس کی ٹائی سے اس
کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے۔
"چلو اب اسے غیر سرکاری حوالات میں لے چلیں۔" انسپکٹر
جمشید بولے۔
"غیر سرکاری حوالات۔ کیا مطلب؟"
"غیر سرکاری حوالات میں سلاخیں نہیں ہوتیں۔"
"مم۔ میں سمجھا نہیں۔"
"تو وہاں پہنچ کر سمجھ جاؤ گے، یہ کون سا الجبرے کا سوال
ہے۔" فاروق خوش ہو کر بولا اور فرزانہ نے اسے کھا جانے
والی نظروں سے گھورا۔

"میں نے کیا کہہ دیا کہ تم اس طرح گھورنے لگیں۔"
"تم جغرافیے کی بات بھی تو کر سکتے تھے۔" محمود ہنسا۔
"بھئی یہ سکول ٹائم نہیں ہے۔" خان رحمان نے انھیں گویا
یاد دلایا۔
اور وہ شارگون کو جیپ میں لاد کر لے چلے۔ شارگون جیپ
میں ہی آیا تھا۔ راستے میں پروفیسر داؤد اور محمد حسین آزاد کو جیپ
سے اُتار کر خان رحمان کے گھر کی طرف روانہ کر دیا گیا۔
آدھ گھنٹے بعد کوئین برج پہنچے۔ یہ انسپکٹر جمشید کی ایک ذاتی
عمارت تھی، بہت ہی خاص موقعوں پر وہ کسی مجرم کو لے کر
یہاں آیا کرتے تھے۔ کوئین برج میں داخل ہونے کے بعد
دروازے اندر سے بند کر دیے گئے۔ اب وہ ایک عجیب کمرے
میں تھے۔ اس کمرے کی عجیب و غریب چیزوں کو شارگون نے
حیرت اور خوف کی نظروں سے دیکھا:
"یہ۔ یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟"
"اس جگہ کا نام کوئین برج ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
"لیکن تم مجھے یہاں کس قانون کے تحت لائے ہو، اگر میں
مجرم ہوں تو مجھے جیل پہنچاؤ، مجھ پر مقدمہ چلاؤ۔"
"میں جانتا ہوں، ایم آئی پی کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، ساری
دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، اس کا دباؤ کئی حکومتوں پر ہے اور وہ

ان کی مدد سے عجیب و غریب کام لے سکتی ہے ۔ لہٰذا تمہیں بھی
رہا کرانے یا جیل سے فرار کرانے کا انتظام کر لیا جاتا ، اس
لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں ۔ ایم آئی پی کے فرشتے بھی اس
جگہ سے واقف نہیں ہو سکتے ، راستے بھر میں نے دھیان رکھا
ہے ، ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا ۔ گویا تمہارے ساتھی اب تمہیں
نہیں ڈھونڈ سکیں گے ۔ تم اس کمرے میں عجیب و غریب
آلات دیکھ رہے ہو ۔ یہ سب زبان کھلوانے کے آلات
ہیں ، اس قسم کے آلات تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے ہوں
گے ، دیکھ بھی کس طرح سکتے تھے ۔ یہ میں نے خود بنائے ہیں،
اگر تم نے زبان نہ کھولی تو پھر ان آلات کو کام میں لایا جائے
گا اور تم فرفر بولنے لگو گے ۔ کیا خیال ہے ؟

" آلات کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ۔ کیا پوچھنا ہے۔" اس
نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

" ہم لوگوں کو قتل کرنے کا منصوبہ کس لیے بنایا گیا ہے ؟" انسپکٹر
جمشید نے پوچھا۔

" تمہارے ملک میں ایم آئی پی کوئی بہت اہم کام انجام دینا
چاہتی ہے ۔ اس کام کی تیاریاں بالکل مکمل ہو چکی ہیں ۔ اب
عمل شروع کرنے کا وقت آ چکا ہے ، لیکن باس نے عمل شروع
کرنے سے پہلے تم لوگوں کو ختم کرنے کا پروگرام بنایا ، کیونکہ

کسی نہ کسی طرح تم لوگوں کو ضرور اس طرف متوجہ ہونا پڑتا اور ہمارے
کام میں رکاوٹ ہو سکتی تھی ۔ یہ ہے اصل بات ۔ اب مجھے چھوڑ
دو ۔"

" ابھی تم نے اصل بات کہاں بتائی ہے دوست ۔ اصل بات تو
صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ بہت اہم کام کیا ہے ۔"

" سوائے باس کے اور کوئی نہیں جانتا ۔ یا پھر ان کارکنوں کو
کسی حد تک معلوم ہو گا جن سے اس اہم کام پر عمل کرانا ہے ۔
ہمارے ذمے چونکہ تم لوگوں کو ختم کرنا لگایا گیا تھا ، اس لیے اس
بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی ۔"

" بھئی جھوٹ نہ بولو ۔" انسپکٹر جمشید اس کی آنکھوں میں جھانک
کر بولے۔

" میں جھوٹ نہیں بول رہا ۔"

" آؤ بھئی چلیں ۔ مسٹر شارگون یہاں مہمان رہیں گے ، جب
تک کہ ہم اس اہم کام کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے ۔"

" کیا مطلب جمشید ۔ کیا تم اس سے اگلواؤ گے نہیں ۔" خان
رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

" میرا اندازہ ہے کہ یہ جھوٹ نہیں بول رہا ، اگر یہ جھوٹ
بول رہا ہوتا تو ان آلات کے استعمال کا کوئی فائدہ بھی
تھا ۔"

"لیکن جمشید۔ تمھارا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"کم از کم میرا یہ اندازہ غلط نہیں ہے ۔۔ یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔"

انھوں نے شارگون کو وہاں بند کیا اور شہر کی طرف روانہ ہوئے ۔ شہری حدود میں پہنچتے ہی انسپکٹر جمشید نے جیپ سے اتر کر ایک فون کیا ، حالانکہ جیپ میں بھی فون مُوجود تھا :

"کیا آپ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں ابّا جان ؟"

"یہی سمجھ لو۔" وُہ مسکرائے ، پھر اُستاد طوطے خان کی طرف مُڑے :

"اب ہم آپ کے دفتر چلیں گے ، وہاں سے کاروں کا رجسٹر لیں گے ، پھر آپ اپنے گھر چلے جائیے گا۔"

"شکریہ جناب ۔۔ خُدا کا شکر ہے ، اس چکر سے نجات ملی ، میں تو سوچ رہا تھا ، شاید اس چکر سے اب کبھی نجات نہیں ملے گی۔"

"آپ غلط سوچ رہے تھے استاد صاحب ۔۔ کوئی چکر ایسا نہیں جو شروع تو ہو جائے اور ختم نہ ہو ، کیا خیال ہے انکل ؟"

یہ کہتے ہوئے فارُوق خان رحمان کی طرف مڑا۔

"لیکن یہ بات تم نے مجھ سے کیوں پوچھی ؟" خان رحمان نے فوراً کہا ۔۔

"اس لیے کہ آپ بھی تو اکثر چکروں میں ہمارے ساتھ چکراتے ہیں۔"

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلّا کر ران پر ہاتھ مارا۔

وُہ استاد طوطے خان کے دفتر میں داخل ہوئے ۔ انھوں نے ایک الماری کھولی اور پھر ان کے منہ سے نکلا :

"ارے ۔۔ یہ کیا ؟"

"کیا ہوا جناب ؟" انسپکٹر جمشید تیزی سے آگے بڑھے۔

"وُہ ۔۔ وُہ ۔۔ وُہ ۔۔ رجسٹر ۔۔"

"کیا ہوا رجسٹر کو ؟" محمود بوکھلا گیا۔

"وُہ غائب ہے۔"

"اوہ !" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔۔

○

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے ، آخر فرزانہ بڑبڑائی :

"بھلا کسی کو اس رجسٹر کے چرانے کی کیا ضرورت تھی ؟"

"تاکہ ہم ان کی کاروں کے ڈرائیوروں کی تفصیل نہ حاصل کر لیں ۔۔ اُستاد طوطے خان سے کچھ کاریں ایم آئی پی کے کارکنوں

نے دھوکے سے حاصل کر لی ہیں ۔ لہذا انھوں نے ہی رجسٹر
چُرایا ہے ۔ ویسے جناب ۔ آپ کے پاس کُل کتنی کاریں
ہیں ؟"

" دس ۔" اُستاد طوطے خان نے کہا ۔

" دس کاریں آپ نے کس طرح خرید لیں ۔" انسپکٹر جمشید حیران
ہو کر بولے ۔

" باپ دادا کی زمین بیچ کر ۔"

" کیا زمین بہت لمبی چوڑی تھی ؟"

" نہیں ۔ اتنی لمبی چوڑی تو نہیں تھی ۔ کسی کو پسند آگئی اور
اس نے منہ مانگے داموں سے خرید لی ، میں نے اس رقم سے
کاروں کا کاروبار شروع کر دیا ۔" اُستاد طوطے خان نے بتایا ۔

" بہت خوب ۔ وہ زمین کہاں تھی ؟"

" ماڈل روڈ کے آخری سرے پر ۔"

" شکریہ ۔ رجسٹر کے گُم ہونے کا افسوس ہے ۔ آپ کے پاس
کوئی دُوسرا رجسٹر نہیں ہے ۔"

" جی نہیں ۔"

" اب آپ ڈرائیوروں سے کس طرح رابطہ قائم کریں گے ؟"

" وہ ہر روز میرے پاس شام کو آتے ہیں ۔ گویا دوسرا رجسٹر
اب شام کو بن سکے گا ۔"

" چلو خیر ۔ ہم شام کو ہی لے لیں گے ۔ آؤ بھئی چلیں ۔"

وُہ طوطے خان سے رخصت ہو کر باہر نکلے ۔ راستے میں انسپکٹر
جمشید نے جیپ سے اُتر کر ایک بار پھر فون کیا اور پھر جیپ
میں سوار ہوتے ہوئے بولے :

" ایک بہت اہم اطلاع ملی ہے ۔ اور اسی اطلاع کی اُمید
بھی تھی ۔"

تیسری کڑی

"اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ کوئی اہم اِطلاع مل گئی، ہم تو ترس گئے تھے اس معاملے میں کسی اہم اِطلاع کے لیے۔" فارُوق خوش ہو کر بولا۔

"لیکن ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں کہ وُہ اِطلاع ہے کیا۔" فرزانہ نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔

"ہم اسی اِطلاع کی طرف جا رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی کیا مطلب۔ اِطلاع کی طرف جا رہے ہیں۔ حیرت ہے، اب ہم اِطلاعات کی طرف بھی جانے لگے۔" فاروق بولا۔

"آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا۔" فرزانہ نے مُنہ بنایا۔

"ابھی تک ہم یہ معلوم نہیں کر سکے کہ ہمارے خلاف یہ سازش کیوں تیار کی گئی تھی۔" محمود اُلجھن کے عالم میں بولا۔

"شاید اب ہم اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

جلد ہی وُہ ایک عمارت کے سامنے رکے۔ اس کے دروازے پر خان دادا کا نام لکھا تھا:

"یہ کون صاحب ہیں؟"

"پتا نہیں۔ ابھی ابھی ان کا نام سننے میں آیا ہے۔ چلو محمود۔ اپنا کام کرو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یعنی کہ گھنٹی بجاؤ۔" فارُوق مسکرایا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے گھنٹی بجانا فضول کام ہو، حالانکہ ہم لوگوں کے لیے یہ بہت اہم کام ہے۔" محمود نے جل کر کہا۔

"بھئی پہلے گھنٹی، پھر بحث۔" خان رحمان ہنسے۔

"کیا یہ کوئی کلیہ ہے انکل۔" فارُوق نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"ہاں! ابھی ابھی بتایا ہے میں نے۔" وہ بولے۔

اتنے میں محمود گھنٹی کا بٹن دبا چکا تھا۔ وہ ایک منٹ تک انتظار کرتے رہے۔ تنگ آکر محمود نے پھر گھنٹی بجائی، تیسری بار گھنٹی بجانے پر بھی کوئی نہ نکلا۔ انھوں نے دروازے پر دباؤ ڈالا، وُہ اندر سے بند تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔

"محمود، فارُوق۔ ذرا اس مکان کا ایک چکر تو لگاؤ۔"

"جی بہتر! ایک کیا ہم تو اس کے دس چکر لگا دیں گے۔"

دونوں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اچانک محمود کے
منہ سے نکلا:

"ارے! یہ کیا؟"

"کہاں کیا ہے؟" فاروق نے منہ بنا کر پوچھا۔

"جاؤ جلدی کرو۔ ابا جان کو یہیں بلا لاؤ۔ اندر ضرور کوئی
گڑبڑ ہے۔" محمود نے کانپتی آواز میں کہا۔

اس کی آواز نے فاروق کو دوڑ پڑنے پر مجبور کر دیا،
چند سیکنڈ بعد ہی سب وہاں موجود تھے:

"ہاں بھئی۔ کیا بات ہے؟"

"یہ کھڑکی کھلی ہے۔" محمود نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا، اس
میں سلاخیں بھی نہیں تھیں۔ کھڑکی کے دوسری طرف ایک کمرہ
تھا۔ کمرے میں گھریلو سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ یوں
محسوس ہوتا تھا جیسے تلاشی لی گئی ہو۔

"آؤ۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور کھڑکی پھلانگ گئے۔

وہ سب کمرے میں آگئے۔ اس کمرے کا دروازہ بھی کھلا
پڑا تھا۔ دروازہ عبور کیا تو برآمدے میں تھے۔ برآمدے کے
دونوں طرف دو دو کمرے تھے۔ جس کمرے سے وہ نکلے تھے۔
وہ پانچواں کمرہ تھا۔ انھوں نے ایک ایک کر کے کمروں کو دیکھنا
شروع کیا۔ آخر سرے والے کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔

ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔
کمرے کے فرش پر ایک شخص اوندھے منہ پڑا تھا۔ انسپکٹر جمشید
کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے انھیں چونکا دیا:

"افسوس! وہ یہاں بھی وار کر گئے۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور اس شخص کو سیدھا کیا۔ یہ
ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم
کا رنگ نیلا پڑ چکا تھا، اگرچہ جسم ابھی گرم تھا:

"شاید اسے زہر دیا گیا ہے۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے کمرے میں رکھے فون پر رومال رکھ
کر ریسیور اٹھایا اور دفتر کے نمبر ڈائل کیے۔ اکرام کو حادثے کی
اطلاع دی اور ریسیور رکھ دیا:

"آخر یہ خان دادا کون تھا ابا جان اور آپ کو اس کے
بارے میں کیا اہم اطلاع ملی تھی؟" فرزانہ بے چین ہو کر بولی۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔ میں ایک فون اور کر لوں گا۔" یہ کہہ کر
انھوں نے پھر احتیاط سے فون کیا اور ریسیور رکھ دیا:

"معاملہ پُر اسرار ہوتا جا رہا ہے۔"

"اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے ساتھ تو ہر معاملہ
ہی پُر اسرار ہوتا چلا جاتا ہے، وہ اور خوش نصیب ہوں
گے جن کے ساتھ کوئی معاملہ بھی پُر اسرار نہیں ہوتا۔" فاروق نے

منہ بنا کر کہا اور وہ مسکرا دیے۔

"لیکن ابا جان! ان حملہ آوروں کا اس شخص خان دادا سے کیا تعلق؟" فرزانہ نے سوال کیا۔

"یہی معلوم کرنے کے لیے تو یہاں آیا تھا، لیکن ایم آئی پی کے کارکنوں نے اس سے پہلے خان دادا کو ٹھکانے لگا دیا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ابھی تک ہم واقعات کے دھارے میں بہے چلے جا رہے ہیں، سوچنے سمجھنے کی ذرا مہلت نہیں ملی۔ اب تھوڑی سی مہلت ملی ہے۔ کیوں نہ غور کر لیا جائے۔" محمود نے گویا تجویز پیش کی۔

"لیکن کس بات پر۔ بات تو صرف اتنی سی ہے کہ ایم آئی پی کے کارکن ہم لوگوں کو ایک ساتھ ہلاک کرنا چاہتے تھے، لیکن کر نہ سکے۔ ہاں ہمیں بعد میں ایک جگہ قید کرنے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ وہاں سے بھی ہم نکل آئے۔ اب اس معاملہ کا اہم ترین سوال یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا۔ ہماری زندگیوں سے انھیں کیا خطرہ ہے۔ یہی راز معلوم کرنے کی خاطر ہم دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ اس دوڑ دھوپ کی پہلی کڑی شارگون تھا۔ اور دوسری کڑی خان دادا ۔۔۔ شارگون کو کچھ معلوم نہیں، لیکن شاید خان دادا کو بہت کچھ معلوم

تھا؛ چنانچہ اسے ختم کر دیا گیا۔ اب ہمیں تلاش ہے تیسری کڑی کی۔ جو ہمیں یہ بات بتا سکے۔"

"اوہ۔ تیسری کڑی۔ یہ تیسری کڑی کون ہے؟" فرزانہ بے تاب ہو گئی۔

"افسوس! مجھے نہیں معلوم۔ اگر معلوم ہوتا تو اکرام کے یہاں پہنچنے کا انتظار کبھی نہ کرتا۔"

"ان حالات میں بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ آخر ہم کس طرح معلوم کر سکیں گے۔ ایم آئی پی وہ کیا کام کرنے والی ہے جس سے پہلے ہمارا کانٹا نکالنا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، کیونکہ انداز اکرام کا نہیں تھا۔ یوں بھی ابھی فون کیے چند منٹ ہی ہوئے تھے:

"یہ کون ہو سکتا ہے؟"

"شاید تیسری کڑی آ گئی۔" فاروق بڑبڑایا۔

"کیا حکم ہے ابا جان۔ دروازہ کھول دیا جائے۔" محمود پُر جوش انداز میں بولا۔

"ہاں! دروازہ تو کھولنا ہی ہو گا۔"

محمود ایک ایک قدم دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ ادھران کے قدم بھی اس کے پیچھے اُٹھ رہے تھے۔ آخر دروازہ کھل گیا اور انھیں ایک ایسے آدمی کی صورت دکھائی دی کہ وُہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے —

○

ان کے سامنے پولیس انسپکٹر کبیر کھڑا تھا۔ اسے یہاں دیکھ کر وُہ حیران رہ گئے:

"آپ یہاں کیسے انسپکٹر کبیر؟" انسپکٹر جمشید کی آواز میں سختی در آئی —

"مم۔میں۔میں —" انسپکٹر کبیر ہکلا کر رہ گیا۔

"اندر آ جائیے، ہم بیٹھ کر بات کریں گے — رات کے اس حصّے میں یہاں کھڑے رہ کر بات کرنا مناسب نہیں۔"

اور وہ اندر آ بیٹھے، لیکن انسپکٹر جمشید انسے لاش والے کمرے کی طرف نہیں لائے تھے:

"اب بتائیے — آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"بس ایسے ہی، خان دادا میرے بہت پُرانے واقف ہیں۔"

"تو آپ نے اسی پرانی واقفیت کی بنا پر حملہ آوروں کی

ضمانت لی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی نہیں۔ یہ حکم تو خود آپ نے دیا تھا کہ جونہی کوئی ان کی ضمانت کے لیے آئے، ضمانت لے لی جائے اور انھیں چھوڑ دیا جائے؛ البتہ ضمانت کرانے والے کا نام انھیں دے دیا جائے — یہی میں نے کیا۔"

"ٹھیک ہے — یہ بات تسلیم کر لیتا ہوں، لیکن اب آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں نے بتایا نا سر کہ — خان دادا میرے بہت پُرانے واقف ہیں۔"

"ہاں! میں سُن چکا ہوں، لیکن رات کے اس وقت یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی — اس کا جواب دیجیے۔"

"جی بس — میں یونہی چلا آیا تھا۔"

"یونہی نہیں — آپ ضمانت لینے کے سلسلے میں اپنا حصّہ وصول کرنے یہاں آئے ہیں — تھانے میں اس لیے حصّہ وصول نہیں کر سکے کہ کہیں مجھ تک بات نہ پہنچ جائے — کہ میرے حکم سے ضمانت لی گئی اور ضمانت دینے والے سے رشوت بھی لی گئی — کیوں — یہی بات ہے نا —"

"نن — نہیں — نہیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"خیر — آئیے — میں آپ کو آپ کے پرانے واقف سے ملوا

دوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور لاش والے کمرے تک آئے۔ لاش پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر کبیر اچھل پڑا اور پھر اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا:

"یہ - یہ - یہ کیا۔"

"اسے لاش کہتے ہیں جناب۔ اور یہ ہے بھی آپ کے پرانے واقف کی لاش، افسوس آپ اس سے اپنا حصّہ وصول نہیں کر سکتے۔" انسپکٹر جمشید گہرے طنزیہ لہجے میں بولے۔

انسپکٹر یک دم گھٹنوں پر بیٹھ گیا اور انسپکٹر جمشید کی ٹانگیں پکڑ لیں:

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ آج کے بعد زندگی بھر کسی سے رشوت لینے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

"میرا خیال ہے انسپکٹر صاحب۔ میں آپ کو معافی دینے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ یہ عدالت کا معاملہ ہے، اُٹھ کر کھڑے ہو جائیے اور اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جائیے۔ میں اس واقعے کی رپورٹ اعلیٰ حکام کو کر دوں گا، پھر وہ جانیں اور ان کا کام — ہاں، اگر آپ نے ان کو بھی رشوت پیش کرکے جان چھڑانے کی کوشش کی تو اس صورت میں میں خود اس معاملے کو عدالت تک پہنچاؤں گا۔"

انسپکٹر کبیر کا رنگ اڑ گیا، اس نے جان لیا، انسپکٹر جمشید اس معاملے میں نرمی ہرگز اختیار نہیں کریں گے، لہذا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کی طرف چل پڑا —

ایک منٹ بعد ہی دروازے کی گھنٹی بجی۔ دروازہ تو پہلے ہی کھلا تھا، اس لیے انسپکٹر جمشید نے ہانک لگائی:

"آ جاؤ بھئی۔" فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور پھر اکرام ماتحتوں کے ساتھ اندر داخل ہوا:

"آپ نے انسپکٹر کبیر کو کیوں بلایا تھا؟"

"میں نے نہیں بلایا، خود آیا تھا۔" یہ کہہ کر انھوں نے اس کے آنے کی وجہ بتا دی۔

"اوہ ہاں سر۔ ان کے بارے میں رشوت بٹورنے کی بہت باتیں سننے میں آتی ہیں۔"

"فکر نہ کرو۔ اب یہ رشوت نہیں لے سکے گا۔ میں ایسے لوگوں سے اپنے معاشرے کو پاک کرنے کا عزم کر چکا ہوں۔" انھوں نے غصّے میں آکر کہا، پھر بولے:

"اکرام — تمھارے لیے ایک عدد لاش اور تیار ہے۔ شروع ہو جاؤ۔ اور ہاں اس کی جیب سے جو چیزیں برآمد ہوں۔ پہلے وہ مجھے دے دو۔ مجھے تلاشی لینے کا خیال ہی نہیں رہا۔"

"جی بہتر!" اکرام نے کہا اور ماتحتوں کو اشارہ کیا۔

وہ کمرے سے نکل آئے۔ اور صحن میں بیٹھ گئے۔ جلد ہی اکرام چند چیزیں اٹھائے وہاں آگیا اور چیزیں میز پر رکھ دیں۔

انھوں نے دیکھا۔ ان میں ایک لائٹر، ایک گھڑی، ایک ماچس اور ایک چھوٹی سی نوٹ بک تھی۔ جس میں فون نمبر لکھے تھے۔

"حیرت ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کس بات پر حیرت ہے؟" محمود نے اسے گھورا۔

"بھئی ہو گی کسی بات پر۔ اس کا کیا ہے۔ اسے تو بات بے بات حیرت ہوتی رہتی ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اور تمھیں تو گویا۔"

"نہیں فرزانہ۔ پہلے یہ بتاؤ۔ تمھیں حیرت کس بات پر ہے۔" انسپکٹر جمشید بے چین ہو کر بولے۔

"اوہ۔ شاید آپ بھی حیرت اور بے چینی محسوس کر رہے ہیں؟"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔" وہ بولے۔

"تو پھر سنیے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اب تک اس معاملے میں ہمارا واسطہ جتنے لوگوں سے بھی پڑا ہے۔ ان کی جیبوں سے سگریٹ لائٹر ضرور نکلے ہیں۔ اور یہ لائٹر بالکل

ایک جیسے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ کہ ان لائٹروں کے ہوتے ہوئے جیبوں سے ماچسیں بھی نکلی ہیں۔ آخر یہ کیا چکر ہے۔" فرزانہ جلدی جلدی کہہ گئی۔

"ہاں! میں بھی اسی بات پر حیران ہوں۔"

فرضی فون

"گویا لائٹر اور ماچس کا چولی دامن کا ساتھ ہے ان لوگوں کے ہاں۔" فاروق مسکرایا۔

"ایک بات کہوں فاروق۔" فرزانہ جل بھن کر بولی۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"تم نے اس کیس کے دوران ایک بات بھی کام کی نہیں کہی۔"

"ارے! واقعی۔ یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔ انداز ایسا تھا کہ خان رحمان بے تحاشہ ہنس دیے۔

"ایک اور خاص بات۔ ایم آئی پی والے کارڈ ہمیں ان تین لاشوں کی جیبوں سے تو ملے۔ اور کسی کی جیب سے نہیں ملا۔ آخر ان کے علاوہ اور کسی کی جیب سے کارڈ کیوں نہیں ملا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابا جان۔ میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"تو بھئی فرزانہ۔ ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ فاروق نے کوئی کام کی بات نہیں بتائی اب تک۔ شاید تمھاری بات نے اس پر جوش طاری کر دیا ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو، دوسرے لوگوں کی جیبوں سے کارڈ نہ ملنے کی وجہ۔" خان رحمان شوخ آواز میں بولے۔

"جی نہیں انکل۔ میں نہیں سمجھ سکی۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھ سے سنو۔ اور خود کو ضرورت سے زیادہ عقل مند نہ سمجھا کرو۔"

"خیر۔ ایسا تو میں ہرگز نہیں سمجھتی۔"

"چلو فاروق بتاؤ۔" انسپکٹر جمشید اس کی طرف مڑے۔

"جن تین لاشوں کی جیبوں سے کارڈ ملے۔ ان کے کارڈ نکالنے کا ایم آئی پی کے کارکنوں کو موقع نہیں ملا تھا۔ باقی لوگوں کے کارڈ نکالنے کا انھیں موقع مل گیا۔"

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

"کیوں فرزانہ۔ اب تو تم یہ نہیں کہو گی کہ فاروق نے ۔۔"

"جی نہیں انکل۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"خیر۔ ان لائٹروں کو بھی دیکھنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے، یہ لائٹر نہ ہوں۔ کوئی اور چیز ہوں۔ اور اسی لیے ان کے ساتھ ماچس رکھنے کی ضرورت بھی پیش آتی ہو۔"

"تو اسی وقت دیکھ لیں لائٹر کو۔"

"نہیں۔ تمہارے پروفیسر انکل جائزہ لیں گے۔ اور یہاں سے ہم اب گھر ہی جائیں گے، کیونکہ دن نکلنے والا ہے۔ ساری رات اسی چکر میں گزر گئی ہے۔"

"اور یہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ چکر کیا ہے۔"

"ہاں! اسی بات کا تو افسوس ہے۔"

"اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم کوئی بہت اہم بات نظر انداز کر گئے ہیں۔" محمود نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"تمھیں تو ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوتا رہتا ہے۔" فاروق جھلا اُٹھا۔

"لیکن اس میں میرا کیا قصور۔" محمود نے معصومانہ انداز میں کہا اور وہ مسکرا دیے۔

"ویری گڈ محمود۔ فاروق کو خوب جواب دیا۔"

"زبردستی محمود کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش نہ کرو۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"اگر لڑنا ہی ہے تو گھر جا کر لڑنا۔ تاکہ باقی لوگ بھی لطف اندوز ہو سکیں۔ ورنہ انھیں شکایت ہو گی۔" انسپکٹر جمشید نے مشورہ دیا۔

"نیک مشورہ ہے، میں اس کی تائید کرتا ہوں۔" خان رحمان

نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"محمود کی بات درمیان میں رہ گئی۔ یہ کہہ رہے تھے کہ شاید ہم کوئی بہت اہم بات نظر انداز کر رہے ہیں۔" اکرام نے گویا یاد دلایا۔

"یہ محمود کا خیال ہے۔ لہٰذا محمود ہی سوچے گا کہ وہ کیا بات ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"اور میں سوچ چکا ہوں۔ وہ بات ہے ماڈل روز۔" محمود نے پُر جوش انداز میں کہا۔

"ماڈل روز۔ کیا مطلب؟"

"اُستاد طوطے خان نے بتایا تھا کہ اس نے اپنی زمین جو کہ ماڈل روز کے آخری سرے پر تھی، منہ مانگے داموں سے فروخت کر دی تھی اور اس رقم سے کاریں خریدی تھیں۔ اس کی کاروں کا تعلق ایم آئی پی سے بھی ہے۔ کہیں وہ عمارت ایم آئی پی کی ہی نہ ہو اور انھوں نے اُستاد طوطے خان کو اپنے ہاتھوں میں کھلونا نہ بنا رکھا ہو۔"

"وہ مارا۔" انسپکٹر جمشید اُچھل پڑے۔

ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک لہرائی۔

○

چند لمحے تک سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھتے رہے، آخر خان رحمان بولے:

" ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے محمود نے واقعی کوئی اہم بات بیان کر دی ہو۔"

" ہاں خان رحمان - میں جُوں جُوں سوچتا جاتا ہوں - اس خیال میں بہت وزن محسوس کرتا ہوں، گھر جانے سے پہلے ہمیں وہاں جانا ہی ہوگا۔"

" تو پھر چلو - لیکن کیوں نہ ہم گھر فون کر کے ان کی خیریت معلوم کر لیں، کیونکہ ان لوگوں کے ساتھ آخر پروفیسر داؤد بھی تو ہیں۔" خان رحمان نے تجویز پیش کی۔

" ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے خان رحمان کے گھر کے نمبر ڈائل کیے - جلد ہی سلسلہ مل گیا اور بیگم جمشید کی آواز سُنائی دی:

" ہیلو بیگم - سناؤ - یہاں سب خیریت تو ہے۔"

" جی ہاں - اور تو سب خیریت ہے، تھوڑی دیر پہلے آئی جی صاحب کا فون ملا تھا - وہ آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے - پروفیسر صاحب نے انھیں بتایا کہ آپ لوگوں کا کچھ پتا نہیں؛ چنانچہ آئی جی صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی پر بلا لیا اور وہ چلے گئے۔"

" کیا کہا - چلے گئے - انھیں جانا نہیں چاہیے تھا۔" انسپکٹر

جمشید بوکھلا اُٹھے۔

" اوہ - تو کیا وہ فون فرضی تھا۔"

" میں یہ نہیں کہتا - خیر ٹھہرو - میں ذرا آئی جی صاحب کو فون کر لوں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے بے تابی کے عالم میں آئی جی صاحب کو فون کیا - دوسری طرف سے فوراً ریسیور اُٹھا لیا گیا:

" ہیلو سر - انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔"

" اوہ جمشید - تم کہاں تھے - میں نے تمھاری تلاش میں کہاں کہاں فون نہیں کیا۔" آئی جی شیخ نثار احمد بولے۔

" پہلے آپ یہ بتائیے - کیا پروفیسر صاحب آپ کے پاس پہنچ چکے ہیں؟"

" ہاں بالکل۔"

" تب پھر میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔"

" ضرور - میں بھی تو یہی کہنے والا تھا کہ فوراً آجاؤ - محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی لے آنا۔"

" صرف ان کو ہی نہیں - خان رحمان کو بھی لا رہا ہوں سر۔" وہ مسکرائے۔

" اوہ بالکل ٹھیک۔" شیخ صاحب بولے۔

لیکن انسپکٹر جمشید نے صاف محسوس کیا، ان کی آواز میں

ذرا بھی گرم جوشی نہیں تھی۔ بلکہ آواز قریب قریب مُردہ تھی۔

"آؤ بھئی چلیں۔ ضرور کوئی حد درجے سنجیدہ معاملہ پیش آ چکا ہے۔" وہ بولے، پھر اکرام کی طرف مُڑے:

"اکرام تم یہاں کی کارروائی سے نبٹ لو، پھر دفتر پہنچ جانا۔ تاکہ مجھے ضرورت پڑے تو فون کر سکوں۔"

"جی بہتر!"

"لیکن ابا جان! ماڈل روز کا پروگرام رہ جاتا ہے۔" محمود نے یاد دلایا۔

"آئی جی صاحب سے مُلاقات کے بعد اُدھر کا ہی رُخ کریں گے۔"

ان کی جیپ آندھی اور طوفان کی طرح اُڑی جا رہی تھی۔ آخر پندرہ منٹ بعد وہ آئی جی صاحب کی کوٹھی کے سامنے اُترے اور اندر کی طرف دوڑے۔ دروازے پر مسلح پہرہ تھا۔ ان لوگوں کو فوراً اندر جانے دیا گیا۔

"ڈرائنگ روم میں آئی جی صاحب کے ساتھ صرف پروفیسر داؤد ہی نہیں، ڈی آئی جی افتخار احمد خان بھی موجود تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بول اُٹھے:

"شکر ہے جمشید۔ تمھاری صورت دکھائی دی۔"

"خیریت تو ہے جناب۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آؤ جمشید۔ پہلے بیٹھ جاؤ۔ تم لوگوں کی رات بھر کی کہانی جس حد تک پروفیسر صاحب سُنا سکتے تھے، ہمیں سُنا چکے ہیں۔ باقی کہانی تم سناؤ۔ تاکہ ہم بات کر سکیں۔"

انسپکٹر جمشید نے رات بھر کے واقعات دہرا دیے۔

"ہوں۔ تب پھر یہ ایک ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔"

"جی کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے۔

"ابھی ابھی ایک خُفیہ اِطلاع ملی ہے، ایم آئی پی کو کوئی خاص مشن سونپا گیا ہے، اس مشن کا تعلق صرف اور صرف ہمارے مُلک سے ہے، اِطلاع دینے والے ہمارے جاسوس کا کہنا ہے کہ ایم آئی پی اپنا کام شروع کر چکی ہے۔ بلکہ کئی دنوں سے وہ اپنے کام میں مصروف ہے۔ ہمارے جاسوس کو یہ اِطلاع دیر سے ملی۔ ساتھ ہی اس کا بیان یہ بھی ہے کہ ایم آئی پی کو یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ اس حد تک اطلاع یہاں پہنچنے والی ہے۔" یہاں تک کہہ کر شیخ نثار احمد خاموش ہو گئے۔

"ہوں! اب بات سمجھ میں آ گئی۔ ایم آئی پی نے سوچا ہو گا کہ جونہی یہ اِطلاع یہاں پہنچے گی، میں حرکت میں آ جاؤں گا۔ نہ صرف میں، محمود، فاروق، فرزانہ بلکہ خان رحمان اور پروفیسر صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوں گے اور سابقہ تجربات کی بنا پر کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کے مشن کو ناکام بنا دیں،

چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ہمیں ختم ہی کر دیا جائے
یہ اور بات ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے، بلکہ اُلٹا
ہم ان کے ایک اہم آدمی شارگون کو گرفتار کرنے میں کامیاب
ہو گئے۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ تو
ایک ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔"

"اب سوال یہ ہے کہ ان کا مشن کیا ہے؟" ڈی آئی جی
بولے۔

"یہ معلوم ہونے کی دیر ہے، پھر ہم ان کے راستے کی دیوار
بننے میں دیر نہیں لگائیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے پُر عزم لہجے
میں کہا۔

"ابا جان! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شارگون ضرور کچھ
جانتا ہے۔ کہیں ہم نے اسے کوئین برج میں تنہا چھوڑ کر
غلطی تو نہیں کی۔" فرزانہ کے انداز سے بے چینی ٹپک رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے، تمھارا خیال ٹھیک ہو، ہم پھر اس سے
مل لیتے ہیں، یوں بھی اب یہاں ہمارا کام نہیں رہا۔ کیا
ہمیں اجازت ہے سر۔"

"ہاں ضرور۔ جس قدر جلد ممکن ہو سکے، یہ معلوم کر لو کہ وہ کیا
چاہتے ہیں۔"

"شکریہ۔ ہم جا رہے ہیں، آپ فکر نہ کریں۔" انھوں نے
اُٹھتے ہوئے کہا، پھر پروفیسر صاحب کی طرف دیکھ کر رُک گئے۔

"آپ کا کیا فیصلہ ہے پروفیسر صاحب؟"

"کس بارے میں؟" وہ حیران رہ گئے۔

"آپ ہمارے ساتھ چلیں گے یا آرام کریں گے۔"

"آرام کر کے کیا کروں گا۔ ملک کے لیے کام کرتے کرتے
ختم ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔" وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

باہر نکل کر جیپ میں بیٹھے اور کوئین برج کی طرف روانہ
ہو گئے۔ ابھی وہ عمارت کے نزدیک پہنچے تھے کہ انھوں نے
ایک سبز کار کو تیزی سے موڑ کاٹ کر دائیں طرف ایک سڑک
کا رُخ کرتے دیکھا:

"ارے! کہیں اس کار میں شارگون کو تو نہیں لے جایا جا رہا۔"
انسپکٹر جمشید چلا اُٹھے۔

"ضرور یہی بات ہے ابا جان۔"

"تو پھر تم تینوں یہیں اُتر جاؤ۔ تاکہ کوئین برج کا جائزہ
لے سکو۔ ہم سبز کار کے تعاقب میں جاتے ہیں۔"

یہ کہتے ہی انھوں نے فوراً بریک لگایا، انھیں ایک
زور دار جھٹکا لگا، ساتھ ہی محمود نے دروازہ کھول دیا۔
آن کی آن میں تینوں نیچے اُتر چکے تھے۔ انھوں نے عمارت کی

طرف دوڑ لگا دی اور جیپ سبز کار کے پیچھے چل دی۔

"لو بھئی ۔ ہم پھر الگ ہو گئے ۔ نہ جانے اب کب ملاقات ہو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"فکر نہ کرو ۔ اپنے ہی شہر میں موجود ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"اور مجھے حیرت ہے ۔ انھوں نے کوئین برج کا دروازہ کس طرح کھول لیا ۔ تالا کھولنا تو ان کے بس کی بات نہیں تھی ۔"

"یہ اتنی عجیب بات نہیں ، کیونکہ ایم آئی پی کے کارکن کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں ۔ ان کے پاس ہر قسم کے آلات ہوں گے ان کے ذریعے تالا کھول لیا گیا ہو گا ۔ سوال تو یہ ہے کہ ایم آئی پی کے کارکنوں کو یہ بات معلوم کس طرح ہو گئی کہ ہم نے شارگون کو کوئین برج میں قید کر دیا ہے۔" محمود پُر خیال لہجے میں بولا ۔

"اوہ ہاں ۔ واقعی ۔ یہ بات تو واقعی قابلِ غور ہے۔"

"ذرا بھی قابلِ غور نہیں ہے ۔ اوہو ۔ دروازے میں تو بڑا سا سوراخ نظر آ رہا ہے ، گویا کسی شعاعی پستول وغیرہ سے اسے جلایا گیا ہے۔" فاروق نے چونک کر کہا۔

ان کی نظریں دروازے پر جم گئیں ۔ اس میں اتنا بڑا سوراخ ہو چکا تھا کہ پورا قفل ہی درمیان سے نکل گیا تھا ۔

"صاف ظاہر ہے ۔ اب شارگون اندر نہیں ہے ۔ سبز کار میں اسے ہی لے جایا گیا ہے ۔ ورنہ یہاں آس پاس کسی کار کا کیا کام ۔" محمود بڑبڑایا۔

"ہوں ٹھیک ہے ۔ فاروق تم کیا کہہ رہے تھے ۔ ذرا بھی قابلِ غور نہیں ہے۔" فرزانہ نے گویا اسے یاد دلایا۔

"ہاں ! اس بات کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ شارگون کے پاس کوئی ایسا آلہ تھا جس سے اس نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا تھا کہ اسے کہاں قید کیا گیا ہے۔"

"ایسا آلہ ۔ لیکن ابا جان نے بھلا ایسا کوئی آلہ اس کے پاس کب رہنے دیا تھا۔"

"بھئی ہم نے اس کے ہاتھ کی گھڑی تو نہیں اتاری تھی نا ۔ آج کل تو کلائی گھڑیوں میں بھی ایسے آلات لگے ہوتے ہیں۔"

"اوہ ہاں ۔ میرا خیال ہے ، فاروق ٹھیک کہہ رہا ہے ، دوسرے لفظوں میں آج اس کی عقل بھی کام کر رہی ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو ، عام طور پر میری عقل کام نہیں کرتی۔" فاروق نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"ایک بات تم خود ہی سوچتے ہو اور پھر گھورنے ہمیں لگ جاتے ہو ، آؤ اندر چلیں ۔ کیا خبر وہ لوگ کوئی سراغ چھوڑ گئے ہوں۔" فرزانہ جلے کٹے لہجے میں بولی۔

تینوں اندر داخل ہوئے اور اس کمرے میں آئے جس میں شارگون کو رکھا گیا تھا — اس کمرے کا دروازہ بھی کاٹ دیا گیا تھا - اندر ہر چیز الٹی پلٹی پڑی تھی - گویا انھوں نے عمارت کی تلاشی بھی لی تھی ، لیکن یہاں زبان کھلوانے کے آلات کے سوا رکھا ہی کیا تھا —

" یہاں کچھ نہیں ہے ، اس سے تو بہتر تھا ، ہم جیپ میں ہی چلے جاتے ۔" محمود بڑبڑایا۔

" فکر نہ کرو - ابا جان کو جونہی فرصت ملی - وہ ہمیں یہاں فون کریں گے - اس لیے ہمیں یہاں سے جانا نہیں چاہیے ۔" فرزانہ بولی —

" اور یہاں ٹھہر کر کیا کریں ۔" فاروق جل کر بولا۔

" انتظار - اور صبر - لیکن میں جانتی ہوں - یہ دونوں باتیں تمھارے بس کی نہیں ۔"

" ہاں ، لیکن اس میں میرا کیا قصور ۔" فاروق نے مسمسی صورت بنائی —

وہ واقعی انتظار کرنے سے گھبراتا تھا اور ایسے معاملات میں اس سے صبر بھی نہیں ہوتا تھا —

" کاش ، ہمیں کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں ۔"

" بھئی ہو جائے گا آہستہ آہستہ معلوم - اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے ۔" فاروق مسکرایا۔

" جلدی کی ضرورت اس لیے کہ ایم آئی پی کے کارکن آہستہ کام کرنے کے عادی معلوم نہیں ہوتے ۔"

" اب وقت تو گزارنا ہی ہے - اخبارات کا مطالعہ کیوں نہ کر لیا جائے ۔"

" یہاں تازہ اخبار کہاں ۔"

" پرانے اور ضروری اخبارات ابا جان یہاں ضرور رکھتے ہیں ۔"

وہ لائبریری میں جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ میز کے ایک پائے سے چپٹا کاغذ کا ایک پرزہ محمود کو نظر آگیا - محمود ٹھٹک کر رک گیا :

" ارے - یہ کیا ؟"

فاروق اور فرزانہ بھی مڑے ، پھر فرزانہ نے جھک کر کاغذ کا پرزہ اٹھا لیا ، یہ ایک اخبار کا تراشہ تھا - اس پر ایک چھوٹی سی خبر تھی - جوں جوں وہ خبر پڑھتے گئے - ان کی آنکھیں حیرت اور خوف کی زیادتی سے پھیلتی چلی گئیں —

○

خوف کا وہم

سبز کار والوں نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے ، لہذا رفتار یک دم بڑھ گئی - انسپکٹر جمشید نے بھی رفتار میں اضافہ کر دیا اور برابر دباؤ ڈالتے چلے گئے — یہاں تک کہ سبز کار کے بہت نزدیک پہنچ گئے - اچانک سبز کار سے ایک فائر ہوا اور جیپ کا شیشہ توڑ کر گولی دوسری طرف نکل گئی - وہ اگر جھک نہ جاتے تو ان میں سے کم از کم ایک تو گولی کا شکار ہو ہی گیا تھا - عین اسی وقت ایک فائر اور ہوا اور ٹائر پھٹنے کی آواز گونج اٹھی :

" لو بھئی - جیپ تو ہو گئی برباد - جب تک ہم ٹائر بدلیں گے ، سبز کار کہیں کی کہیں پہنچ جائے گی " انسپکٹر جمشید مایوسانہ انداز میں بولے -

" تب پھر کیا کیا جائے ؟ " خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا -

" ٹھہرو ! میں عملے کے ذریعے اسے گھیرنے کی کوشش کرتا ہوں "

یہ کہہ کر وہ جیپ میں لگے فون پر جٹ گئے - تھوڑی دیر بعد وہ ٹائر بدل چکے تھے اور ایک بار پھر اڑے جا رہے تھے ، ساتھ ساتھ وہ ماتحتوں سے بھی رابطہ قائم کیے ہوئے تھے ، لیکن ابھی تک سبز کار کسی گشتی کار کو نظر نہیں آئی تھی - آخر ایک گھنٹے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سبز کار کی تلاش بے کار ہے ، ایسے ہی انسپکٹر جمشید چونک اٹھے :

" کہیں یہ کار بھی استاد طوطے خان کی نہ ہو "

" اوہ ہاں ! یہ عین ممکن ہے "

" ہوں ! فون کرنے کی بجائے ، ہم خود ہی اسے کیوں نہ ٹٹول لیں " انسپکٹر جمشید بڑبڑائے -

" ادھر محمود ، فاروق اور فرزانہ پریشان ہو رہے ہوں گے " پروفیسر داؤد نے خیال دلایا -

" وہ پریشان ہونے والی چیزیں نہیں " انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا اور جیپ کا رخ ایک اور سڑک پر موڑ دیا - استاد طوطے خان سے علیحدہ ہوتے وقت انسپکٹر جمشید اس سے اس کے گھر کا پتا معلوم کر چکے تھے -

گھنٹی کے جواب میں خود استاد طوطے خان نے دروازہ کھولا ، اس کی آنکھوں میں نیند کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے :

" شاید آپ ابھی تک سوئے نہیں " انسپکٹر جمشید بولے -

"جی نہیں — تھوڑی دیر بعد دفتر کا وقت ہو جائے گا — سو
کر کیا کروں گا — خیر تو ہے، آپ میرے ہاں کیسے تشریف لائے۔"
"اندر چلیے۔" وہ بولے۔
اُستاد طوطے خان کا مکان بہت عالی شان تھا۔ مکان کے
طرز پر بنا ہوا تھا، لیکن کوٹھیوں سے زیادہ خوبصورت اور بڑا
تھا — اس کے چاروں طرف سبزہ لہلہا رہا تھا، وہ انھیں ڈرائنگ
روم میں لے آیا، ڈرائنگ روم بھی بہت قیمتی چیزوں سے سجا
تھا:
"جی — فرمایئے۔"
"آپ کی کاروں میں کوئی کار سبز رنگ کی بھی ہے؟"
"سبز رنگ کی تو دو کاریں ہیں۔" اس نے کہا۔
"اوہ — مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کی سب کاریں
جرائم پیشہ لوگ چلا رہے ہیں۔"
"اُف خدا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، کیا کوئی اور واردات
ہو گئی —"
"ایم آئی پی کے کارکن اس مکان سے شارگون کو نکال لے گئے،
وہ ایک سبز کار میں آئے تھے۔"
"آپ نے نمبر نوٹ کیے تھے؟"
"نہیں، اتنا موقع نہیں مل سکا — جونہی ہم نزدیک ہوئے،

ادھر سے فائرنگ کر دی گئی۔"
"اوہ!" استاد طوطے خان کے منہ سے نکلا۔
"آج آپ اپنی تمام کاریں جمع کرنے کی کوشش کریں — اور ڈرائیوروں
کو پابند کریں کہ شام کو آپ کے دفتر میں ضرور پہنچ جائیں —
میں ان سب سے ملاقات کرنا پسند کروں گا۔"
"جی بہت بہتر —" اس نے کہا۔
ایسے میں انسپکٹر جمشید کو کچھ خیال آیا — انھوں نے تپائی
پر رکھے فون پر کوتین برج کے نمبر گھمائے — دوسری طرف سے
فوراً ریسیور اٹھایا گیا اور محمود کی آواز سنائی دی:
"یہ آپ ہی ہیں نا ابا جان۔" وہ بولا۔
"ہاں! تمھاری آواز کیوں کانپ رہی ہے — تم پر جوش
سوار ہے یا خوف؟" انسپکٹر جمشید نے جلدی سے پوچھا۔
"ج — جوش —" وہ بولا۔
"تب تو ٹھیک ہے — اب یہ بھی بتا دو کہ یہ جوش کس
سلسلے میں ہے؟"
"ہم نے ایک بہت ہی خاص بات معلوم کی ہے — اور
فوراً آپ تک پہنچ جانا چاہتے ہیں۔"
"اگر یہ بات ہے تو وہیں ٹھہرو۔" انسپکٹر جمشید سوچ میں
گم بولے —

"جی - کیا مطلب - وہیں ٹھہریں۔"

"ہاں! تمہارا وہاں سے نکلنا غلط ہے، کیونکہ اگر تم نے کوئی بہت ہی خاص بات معلوم کر لی ہے اور راستے میں ایم آئی پی کے کارکن تم سے ٹکرا گئے تو فوراً ہم تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم تم تک پہنچ جائیں۔"

"جی بہتر۔ تو پھر ہم انتظار کر رہے ہیں۔"

"یہی مناسب ہے۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے:

"آئیے بھئی چلیں — اور جناب — آپ اپنے ڈرائیوروں کو جمع کرنے کی کوشش کریں، ان سب کو چیک کیا جائے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں، یہ کام آج ہو جائے گا۔ شام کو جب آپ میرے دفتر تشریف لائیں گے تو سبھی وہاں موجود ہوں گے۔"

"شکریہ۔" اور وہ دروازے کی طرف مڑ گئے۔

کوئین برج پہنچنے میں انھوں نے دیر نہ لگائی —

"خدا کا شکر ہے، آپ آ گئے۔" فرزانہ نے خوف زدہ آواز میں کہا —

"کیوں — کیا بات ہے؟" انسپکٹر جمشید گھبرا گئے۔

"اسے خوف کا وہم ہو گیا ہے ابا جان۔"

"خوف کا وہم — کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" فاروق خوش ہو گیا۔

"نہیں! میں ہرگز یہ نہیں کہنا چاہتا۔" انسپکٹر جمشید تیز آواز میں بولے۔

"تو پھر سنیئے۔ فرزانہ کا خیال ہے، ہمیں فوراً یہاں سے چل دینا چاہیے — کہیں وہ لوگ کوئین برج کو گھیر نہ لیں۔ آس پاس آبادی بھی نہیں ہے — وہ ہمیں بہت آسانی سے گھیر سکتے ہیں۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ ہمیں یہاں رکنے کی ضرورت بھی کیا ہے — آؤ چلیں۔"

"لیکن جمشید — میرا خیال ہے۔ ہمیں رکنا ہو گا۔" خان رحمان کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

"کیا مطلب — وہ کیسے؟"

"میں نے ابھی ابھی ایک ہلکی سی آواز سنی ہے۔" فرزانہ نے سرسراہٹ زدہ لہجے میں کہا۔

"ہلکی سی آواز — اوہ ہاں ٹھیک ہے۔ ہلکی سی آواز بھلا تمہارے علاوہ کون سن سکتا ہے۔"

"ایک منٹ ٹھہریے — میں ابھی آئی۔"

فرزانہ کا انداز حد درجے پُراسرار تھا — وہ قریباً دوڑتی ہوئی ان کے پاس سے دروازے کی طرف چلی گئی۔ پھر وہاں سے

پلٹ کر سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی ۔ واپسی پر اس کا رنگ زرد تھا :

" ہماری موت کا سامان کیا جا چکا ہے ۔" اس نے سرد آواز میں کہا ۔

" کیسے ؟" انسپکٹر جمشید پُرسکون آواز میں بولے ۔

" عمارت کے چاروں طرف دُشمن موجود ہیں اور آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں ۔"

" اوہ !" ان کے منہ سے نکلا اور پھر انسپکٹر جمشید کی نظریں خان رحمان پر جم گئیں ۔

" مم ۔ میں نے کیا کیا ہے بھئی ۔ تم تو مجھے اس طرح گھور رہے ہو جیسے عمارت کو گھیرنے کی ہدایات میں نے ہی تو دی ہیں ۔"

" تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ ہمیں یہاں رکنا ہو گا ۔ اس کا کیا مطلب تھا ۔"

" اپنے فوجی تجربے کی بنا پر میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ عمارت کو گھیرے میں لیا جا چکا ہے ۔"

" اوہ ۔ اب کیا کرنا ہے ۔"

" کرنا کیا ہے ۔ ہم ان کا مقابلہ کریں گے ۔"

" لے دے کے ہمارے پاس دو پستول ہیں اور ایک چاقو ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔ انھوں نے شارگون کو قید کرنے کے بعد چاقو اس سے

لے لیا تھا ۔

" ہاں ! یہ تو ہے ۔ ٹھہرو ۔ میں چھت پر جا کر ان کی تعداد کا اندازہ لگا لوں ۔" خان رحمان نے کہا اور جلدی جلدی اُوپر چڑھنے لگے ، پھر وُہ نیچے آئے :

" جمشید ۔ ان کی تعداد بیس کے قریب ہے ۔ مکان کے چاروں طرف مَوجود ہیں اور اسلحے سے لیس ہیں ۔ کوئی دم میں فائرنگ کرنے والے ہیں ۔"

" ہم سے بہت غلطی ہوئی خان رحمان ۔ سبز کار کے نکل جانے کے بعد محمود ، فارُوق اور فرزانہ کو یہاں سے بلا لینا چاہیے تھا ، خیر دیکھا جائے گا ۔ آؤ چھت پر چلیں ۔"

ابھی انھوں نے سیڑھیوں کا رُخ کیا ہی تھا کہ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا ۔ وُہ منہ کے بل گرے ۔ اور ساتھ ہی بہت سا ملبہ ان پر آ گرا ۔ ان کے ذہن تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے ، ہوش آیا تو خود کو ہسپتال میں پایا ۔ دھماکے کی آواز دُور دُور کے لوگوں نے سُن لی تھی اور وُہ کوئین برج کی طرف دوڑ پڑے تھے ، پھر انھوں نے ہی انہیں ہسپتال تک پہنچایا ۔ اور اس وقت ان کے اردگرد نہ صرف اپنے گھر کے افراد تھے ۔ بلکہ دفتر کے بھی سبھی ہمدرد آفیسر مَوجود تھے ۔ آئی جی صاحب کی آنکھوں سے تو فکر مندی ٹپک رہی تھی ؛ تاہم انہیں ہوش میں آتے دیکھ کر ان

کے چہرے چمک اُٹھے :

"آپ لوگوں کو بس اللہ نے بچا لیا — ملبہ کچھ اس طرح اوپر گرا تھا کہ جسم بالکل چھپ گئے تھے، لیکن چند لکڑیوں وغیرہ کی وجہ سے ملبے کے اندر ہوا کی آمد و رفت جاری رہی — ورنہ دم گھٹ چکے تھے — دشمنوں نے جب آپ لوگوں کے جسم بالکل غائب پائے تو انھوں نے مزید چھان بین کی ضرورت نہیں سمجھی، ملوں بھی دھماکے کی آواز دُور دُور تک سُنی گئی تھی اور لوگ ادھر کا رُخ کر چکے تھے — اس لیے انھوں نے کھسک جانا ہی مناسب خیال کیا۔"

"لل — لیکن ابا جان — ہم لیٹے نہیں رہ سکتے۔" فرزانہ بے چین ہو گئی —

"اوہ ہاں — وہ بات پوچھنے کا تو موقع ہی نہیں ملا — جو تم نے معلوم کی تھی۔"

"آیئے چلیں۔" فرزانہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے ارے — ڈاکٹر صاحبان نے آپ لوگوں کو کم از کم تین دن آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔" شیخ صاحب بولے۔

"تین دن — نہیں انکل — ہم تو یہاں تین منٹ بھی مزید نہیں ٹھہر سکتے۔"

"بالکل ٹھیک۔" محمود بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا —

انھیں اپنی چوٹوں اور خراشوں میں آگ سی لگتی محسوس ہوئی — لیکن انھیں ایک اور آگ بجھانا تھی جو اس آگ کی نسبت بہت بڑی آگ تھی — اس لیے وہ افراتفری کی حالت میں باہر کی طرف دوڑے، ایسے میں دوسری طرف سے ڈاکٹر صاحبان کا ایک گروپ آتا نظر آیا — انھوں نے ان لوگوں کو پہچانا تو چلّا اُٹھے :

"یہ کیا — آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"اپنی زندگی کا مقصد پورا کرنے۔"

"نہیں نہیں — آپ لوگوں کے لیے تین دن کا آرام بہت اہم ہے۔"

"وہ ہم بعد میں کر لیں گے۔" فاروق نے گویا اعلان کیا۔

اور تو اور پروفیسر داؤد بھی لیٹے نہیں رہے تھے، حالانکہ وہ بہت کمزوری محسوس کر رہے تھے۔

"جمشید — اگر کہیں جانا اتنا ہی ضروری ہے تو آپ لوگوں کے لیے آرام دہ گاڑی کا انتظام کر دیا جائے۔"

"جی نہیں — ہم انتظار نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر اپنے ساتھ اکرام اور سادہ لباس والے لے جاؤ۔"

"جی نہیں — ان کی موجودگی میں کام خراب ہو سکتا ہے۔" انھوں نے کہا۔

اس وقت تک وہ ہسپتال سے باہر نکل چکے تھے۔

"جمشید - کیا تم میری بات نہیں مانو گے۔" آئی جی بولے۔

"آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر سر۔" وہ مسکراتے ہوئے جیپ میں بیٹھ گئے۔

"تو پھر سادہ لباس والے ساتھ لے جاؤ - آپ اس وقت بہت تکلیف میں ہیں اور تکلیف آپ کے چہروں سے صاف نظر آ رہی ہے۔"

"پروا نہ کریں سر - اپنے دین کے لیے اور ملک کے لیے ہمیں جانوں کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں۔"

"ہوں - اور اگر میں حکم دوں کہ اس طرح نہ جاؤ۔" آئی جی نے انھیں تیز نظروں سے دیکھا۔

"افسوس! میں پھر بھی نہیں رک سکوں گا سر۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آخر تم کہاں جا رہے ہو - کم از کم یہ تو بتا دو۔"

"ابھی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں سر - کہ ہم کہاں جا رہے ہیں - یہ بات صرف محمود، فاروق اور فرزانہ کو معلوم ہے۔"

"اور اس کے باوجود تم اندھا دھند جانے پر آمادہ ہو؟"

"سر! محمود، فاروق اور فرزانہ وقت کی نزاکت کا پورا احساس رکھتے ہیں - میں ان کی اس صلاحیت سے اچھی طرح

واقف ہوں۔"

"تم بتاؤ بھئی - کہاں جانا ہے؟"

"سوری سر - ابھی نہ پوچھیے - کہیں کام خراب نہ ہو جائے۔"

"دھت تیرے کی۔" آئی جی صاحب نے جھلا کر کہا۔

اور ان کے چہرے کھل اٹھے - ان کے جھلانے میں بھی پیار تھا - دوسرے ہی لمحے جیپ آگے بڑھ گئی:

"اب بتاؤ بھئی - کہاں جانا ہے؟" کچھ دور آنے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی - یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔" فرزانہ مسکرائی۔

"کیا کہا - تمھیں بھی نہیں معلوم - تو پھر ہسپتال سے بھاگ آنے کی کیا ضرورت تھی۔" پروفیسر داؤد چلائے۔

"بہت ضرورت تھی انکل، کیونکہ اس جگہ جانا بہت ضروری ہے، جس جگہ ہمیں جانا ہے۔"

"یہی تو سوال ہے کہ کہاں جانا ہے - جب معلوم ہی نہیں تو جائیں گے کیسے۔" خان رحمان تلملا اٹھے۔

"تم تینوں پر آج مذاق کا بھوت کچھ زیادہ تو سوار نہیں ہو گیا - یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ فاروق کے ساتھ ساتھ آج مذاق کے بھوت نے تم دونوں پر قبضہ تو نہیں جما لیا۔" خان رحمان بولے۔

"جی - نہیں تو انکل۔" فرزانہ بوکھلا اٹھی۔

جیپ سڑک پر اُڑی جا رہی تھی - محمود، فاروق اور فرزانہ نے
ابھی تک یہ بھی نہیں کہا تھا کہ غلط سمت میں جا رہے ہیں -
آخر محمود نے جیب سے اخبار کا وہ تراشہ نکال کر ان کے سامنے
کر دیا - اسے پڑھنے کے لیے انسپکٹر جمشید کو جیپ روکنا پڑی —
سڑک کے کنارے رُک کر انھوں نے تراشہ پڑھا اور پھر ان کے
منہ سے نکلا :

" اُف خُدا "

ان کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی خان رحمان نے تراشہ
ان کے ہاتھ سے اچک لیا ، ان کے ساتھ پروفیسر داؤد بھی تراشے
پر جھک گئے - دونوں جلدی جلدی پڑھتے چلے گئے اور پھر ان
کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیلیں - ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا :

" اُف اللہ "

" تراشہ چھ ماہ پہلے کا ہے - ایک غیر مُلکی اخبار کا ہے - ہمارے
ملک میں یہ اخبار آتا بھی نہیں - انتہائی دشمن مُلک ہے یہ ہمارا ،
اور ہمارا ہی نہیں - پورے عالم اسلام کا دشمن ہے " انسپکٹر جمشید
بڑبڑائے -

" جی ہاں - اور جب ہم اس خبر کے الفاظ پر غور کرتے ہیں
تو یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اس خبر کے گھیرے میں آئے
ہوئے ہیں "

" ہاں ! میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں - الفاظ گول مول ہیں -
خفیہ سے ہیں - اور اگر ہم ان حالات کا شکار نہ ہوتے اور اس
صورت میں یہ تراشہ ہماری نظروں سے گزرا ہوتا تو شاید ہم سمجھ
بھی نہ سکتے " انسپکٹر جمشید بولے - ان کی نظریں ایک بار پھر تراشے
کی تحریر پر دوڑنے لگیں ، لکھا تھا :

" ایم آئی پی نے اپنے ایک نئے منصوبے پر کام شروع کر
دیا ہے ، ان کا پہلا قدم یہ ہوگا کہ منصوبے کے راستے
میں جن رکاوٹوں کے آنے کا امکان ہوگا - پہلے ان رکاوٹوں
کو راستے سے ہٹایا جائے گا ، تاکہ راستہ بالکل صاف ہو جائے
اور کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے - اس کے بعد اصل
وار کیا جائے - جس کی تیاریاں چھ ماہ پہلے سے جاری
ہوں گی "

کِس کا منصوبہ

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا :

" شاید یہ تراشہ شارگون کی جیب سے گرا ہوگا۔ یا پھر اسے چھڑا لے جانے والوں میں سے کسی کی جیب میں رہا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

" اور اس کا مطلب ہے، وہ رکاوٹیں ہم ہی ہیں۔" خان رحمان بولے۔

" لیکن سوال یہ ہے کہ اصل منصوبہ کیا ہے؟ پروفیسر داؤد نے کہا۔

" اب یہ سوال اتنا مشکل نہیں رہا پروفیسر صاحب۔" انسپکٹر جمشید زہریلے انداز میں مسکرائے۔

" اوہو اچھا۔ وہ کیسے ؟"

" ایم آئی پی ہمارے بدترین دشمن مُلک بیگال کی جماعت ہے اور اس مُلک کی طرف سے اکثر یہ دعوے کیے گئے ہیں کہ وہ

ہمارے مُلک کی ایٹمی تنصیبات کو اڑا دیں گے۔ لہذا ہمیں فوری طور پر اپنے ایٹمی مرکز کا رُخ کرنا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" لیکن ابا جان ۔ ایٹمی مرکز ہے کہاں ۔ ہم میں سے تو کسی کو بھی نہیں معلوم۔"

" تم لوگوں کو معلوم ہو نہ ہو۔ کم از کم مجھے ضرور معلوم ہے۔"

" ویری گڈ۔ تب پھر دیر کس بات کی۔"

" میں سوچ رہا ہوں۔ خان رحمان۔ اس سلسلے میں مشورہ تم دو۔ ہم اپنے ساتھ فوج لے کر جائیں یا صرف ہم جائیں۔"

" فوج کو ساتھ لے کر جانا خطرناک ہوگا۔ ہم نہیں جانتے، وہاں کیا حالات ہیں، وہ کیا کچھ کر چکے ہیں، اس وقت تک کس حد تک کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔"

" گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ صرف ہم ہی چلیں گے۔"

" ہاں ۔ میں تو یہی کہوں گا۔"

" تو پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور جیپ سڑک پر ایک جھٹکے سے آگے بڑھی ۔

انھوں نے ایک ساتھ بسم اللہ پڑھی ۔

" ہمارے پاس صرف دو پستول ہیں اور محمود کے پاس اس کا چاقو، اور بس ۔ اور ہم چلے ہیں ایم آئی پی کے اس گروہ کا مقابلہ کرنے جس نے ہماری ایٹمی تنصیبات اڑانے کا منصوبہ بنایا

ہے ۔ جمشید ۔ کہیں ہم غلطی تو نہیں کر رہے ہے ؟" پروفیسر داؤد فکرمندانہ انداز میں بولے ۔

"ہو سکتا ہے ، ہم غلطی کر رہے ہوں ، لیکن فوج کو ساتھ لے جانا اور بھی غلطی ہو گی ، کیونکہ اس طرح وہ تمام فوجی اس مرکز سے آگاہ ہو جائیں گے اور ان میں کوئی دشمن ملک کا جاسوس بھی ہو سکتا ہے ۔ ہم میں کم از کم کوئی غیر ملکی جاسوس تو نہیں ہے ۔"

"میں بھی یہی کہتا ہوں ۔" خان رحمان پُرجوش لہجے میں بولے ۔

"چلو پھر ٹھیک ہے ۔ سفر کتنا ہے ؟" پروفیسر داؤد نے پوچھا ۔

"ہمیں تین گھنٹے سفر کرنا پڑے گا ۔ ایٹمی مرکز ایک ایسی جگہ بنایا گیا ہے کہ عام لوگ تو کیا ، خاص لوگ بھی اس جگہ کو ذہن میں نہیں لا سکتے ۔"

"چلیے خیر ۔ ہمیں ذہن میں لانے کی ضرورت بھی کیا ہے ۔ آپ کے ذہن میں جو ہے ۔" فاروق خوش ہو کر بولا ۔

"ویسے ابا جان ۔ ایم آئی پی کا سربراہ کون ہے ؟"

"خود بیگال کا حکمران ۔ ہر ملک میں اس نے اپنے کارکن داخل کر رکھے ہیں اور ان کارکنوں کا ایک چھوٹا سربراہ ہوتا ہے جسے یہ لوگ باس کہتے ہیں ، باس کو براہِ راست بیگال کے حکمران سے

احکامات ملتے ہیں ، جو وہ کہہ دیتا ہے ، باس اس پر فوری طور پر عمل کرتا ہے ۔"

"ہوں ۔ گویا ہمارے ملک میں بھی ان کا ایک چھوٹا باس ہے ۔"

"ہاں اور شاید وہ اس وقت ایٹمی مرکز تک پہنچ چکا ہو گا ۔ کیونکہ اپنے خیال میں وہ ہمیں ملبے میں دفن کر چکے ہیں ۔"

"اوہ خدا ۔ پھر تو ہمیں جلدی کرنی چاہیے ۔" فرزانہ کانپ اٹھی ۔

"اور کتنی جلدی کریں ۔ جیپ اس وقت ایک سو ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ کے حساب سے تو جا رہی ہے ۔"

"اور یہ رفتار بھی بہت خطرناک ہے ، اس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم ذرا کم رفتار پر چلیں ۔ تاکہ وہاں خیریت سے پہنچ تو سکیں ۔ اگر ہم پہنچ ہی نہ پائے تو ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے ۔ دوسرے یہ کہ کسی کو بھی معلوم نہیں ، ہم کہاں کے لیے روانہ ہوئے ہیں ۔"

"لیکن اگر ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنا کام کر گزرے تو ہماری زندگیوں کا کیا فائدہ ہو گا ۔" انسپکٹر جمشید نے جواب دیا ۔

"اچھا بھائی ۔ جیسے تمھاری مرضی ۔" پروفیسر داؤد نے کندھے اچکائے ۔

"آخر آپ نے بھی ہتھیار ڈال ہی دیے نا انکل ۔" فرزانہ مسکرائی ۔

"اور کیا کروں بیٹی ۔ انسپکٹر جمشید کے آگے کس کی چلتی ہے ۔"

وہ بولے۔

اور وہ سب مسکرانے لگے — ٹھیک تین گھنٹے بعد ریگستانی علاقہ شروع ہوگیا — اور سڑک ختم ہوتی نظر آئی — سڑک کے اختتام پر ریت کا ایک سمندر نظر آیا، لیکن اس سمندر سے پہلے ایک خار دار تاروں کی بنی ہوئی دیوار موجود تھی — اور اس دیوار میں ایک دروازہ انھیں صاف نظر آ رہا تھا — دروازے کے دائیں طرف بڑا سا کیبن تھا — اس کیبن کے دروازے پر دو مسلح فوجی پہرہ دے رہے تھے اور دو پہرے دار دروازے پر موجود تھے — ان کے ہاتھوں میں سٹین گنیں موجود تھیں — جو انھوں نے جیپ کو آتے دیکھا — سٹین گنیں جیپ کی طرف اٹھ گئیں — بالکل نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی انھوں نے ایک گرج دار آواز سنی:

"جیپ وہیں روک لی جائے، ورنہ گولی چلا دی جائے گی۔"

انسپکٹر جمشید نے جیپ روک لی —

○

"جیپ سے نیچے اتر کر اپنے ہاتھ سروں سے بلند کر لو۔" دوسرا حکم دیا گیا۔

انھوں نے تعمیل کی — اور وہیں کھڑے رہے —

"ہمارا ایک آدمی تم لوگوں کی طرف آ رہا ہے — اس سے بات کرو۔" کیبن سے آواز ابھری اور پھر اندر سے ایک فوجی آفیسر نکل کر ان کی طرف قدم اٹھانے لگا — اس کے ہاتھ میں بھی ایک بڑا سا ریوالور تھا — نزدیک پہنچ کر وہ چند سیکنڈ تک انھیں کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا، آخر بولا:

"اس طرف کس طرح نکل آئے تم لوگ؟"

"باقاعدہ پروگرام کے تحت آئے ہیں، بھول کر نہیں آگئے۔" انسپکٹر جمشید پرسکون انداز میں مسکرائے۔

"اوہو اچھا — ذرا میں بھی تو سنوں وہ پروگرام۔"

"ہمیں مرکز تک جانا ہے اور ایک ایک چیز کا جائزہ لینا ہے۔"

"کیا مطلب — آپ کون ہیں؟" آفیسر زور سے چونکا۔

"انسپکٹر جمشید — مجھے اور میرے ساتھیوں کو جلد از جلد مرکز تک پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔"

"سوری! کسی کو بھی اجازت نہیں، کیا آپ اجازت نامہ لے کر آئے ہیں؟"

"مجھے اجازت نامہ لے کر آنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ایک اجازت نامہ ہر وقت میری جیب میں رہتا ہے — میں ابھی نکال کر دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ہاتھ نیچے کرنے لگے تھے کہ آفیسر گرج اٹھا:

"خبردار — آپ ہاتھ نیچے نہیں گرائیں گے — میں خود آپ کی جیب میں سے وہ اجازت نامہ نکال لیتا ہوں۔"

"ضرور — مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن ذرا جلدی کریں۔ کہیں وقت نہ گزر جائے، پھر ہاتھ ملنے کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔"

"پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر آفیسر آگے بڑھا اور ان کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا، پھر چونک کر بولا:

"آپ کی جیب میں تو کوئی کاغذ بھی نہیں ہے۔"

"کیا کہا — کوئی کاغذ نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید چلّا اُٹھے۔

"جی ہاں — جس کاغذ کی آپ بات کر رہے ہیں، کسی اور جیب میں تو نہیں۔"

"نہیں، اس کے لیے یہی جیب ہے — آپ میری تلاشی لے لیں — میرے پاس ایک پستول ضرور ہے — وہ آپ اپنے قبضے میں کر لیں اور اس کے بعد مجھے خود اپنی جیبوں کی تلاشی لے لینے دیں۔"

"ٹھیک ہے — مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے کہا اور ان کی دوسری جیب سے پستول نکال لیا، اب ان کی طرف دو پستول اُٹھے ہوئے تھے — اور کیبن کے نزدیک جو چار فوجی کھڑے

تھے، ان کی سٹین گنوں کے رُخ بھی ان کی طرف تھے — اس کے بعد انھوں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا، لیکن خصوصی اجازت نامہ کہیں بھی نظر نہ آیا — ان کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ اجازت نامہ ضرور اسی دوران اِدھر اُدھر ہوا جب انہیں ملبے کے ڈھیر سے نکال کر ہسپتال تک پہنچایا گیا تھا — ہسپتال میں بے ہوشی کے دوران ہی ان کا لباس تبدیل کیا گیا تھا اور یہ لباس خان رحمان کے گھر سے منگائے گئے تھے — البتہ ان کی تمام چیزیں نئے لباس میں رکھ دی گئیں اور اجازت نامہ شاید دوسرے کپڑوں میں رہ گیا تھا یا کہیں گر گیا تھا۔

"کیوں جناب! آپ کے پاس کوئی اجازت نامہ وامہ نہیں ہے نا —"

"ہاں! نہ جانے کہاں رہ گیا — بہر حال میں انسپکٹر جمشید ہوں اور اگر آپ میرے نام سے واقف ہیں تو پھر آپ کو مجھے مرکز تک پہنچا دینا چاہیے۔"

"نہیں — یہ نہیں ہو سکتا، بلکہ ہم تو آپ کو واپس بھی نہیں جانے دیں گے — آپ کو ہمارے اس سوال کا جواب دینا ہو گا کہ یہاں تک کیسے پہنچ گئے — آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ یہاں ایٹمی مرکز ہے۔"

"یہی تو ثبوت ہے میرے انسپکٹر جمشید ہونے کا۔" انھوں نے

منہ بنا کر کہا۔

"سوری! یہ ثبوت نہیں ہے۔ ہم آپ کو حراست میں لے رہے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

ان کی غراہٹ میں نہ جانے کیا تھا۔ آفیسر ہل گیا اور گھبرا کر بولا:

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ۔" یہ کہہ کر انھوں نے اس کے منہ پر ایک گھونسا جڑ دیا۔ وہ تیورا کر گرا، اس کے ساتھ ہی ان کے ساتھی بھی نیچے لیٹ گئے۔ انھوں نے بھی آفیسر کے پاس گرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ گرتے ہی انھوں نے اپنا پستول آفیسر کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ اور اس کے منہ پر پستول کا دستہ دے مارا۔

یہ منظر کیبن کے پاس والے آفیسرز نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا اور پھر وہ فائر کرنے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن اس وقت تک انسپکٹر جمشید ان کی طرف مڑ چکے تھے۔ ان کے پستول سے چار فائر ایک ساتھ ہوئے اور ان کے ہاتھوں سے سٹین گنیں نکل گئیں۔

"خبردار۔ تم لوگ سٹین گنوں کی طرف نہیں بڑھو گے۔ اور کیبن میں جو صاحب ہیں، وہ بھی ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آئیں۔" انھوں نے گرج دار آواز میں کہا۔

خان رحمان نے زخمی کی طرف رینگ کر اس کا ریوالور اپنے قبضے میں لے لیا۔

"تم تینوں رینگتے ہوئے جاؤ اور ان سٹین گنوں پر قبضہ کر لو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"لیکن ابا جان۔ کیبن سے ہم پر فائرنگ ہو سکتی ہے۔"

"پروا نہ کرو۔"

"جی بہت بہتر۔ آپ کہتے ہیں تو ہمیں کیا ضرورت ہے پروا کرنے کی۔ پروا جائے جہنم میں۔" فاروق مسکرایا۔

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

تینوں رینگنے لگے۔ اور آخر سٹین گنوں تک پہنچ گئے۔ اسی وقت کیبن سے ایک لمبے قد کا فوجی آفیسر برآمد ہوا، اس کی آنکھیں خون اگل رہی تھیں، ہاتھ میں ایک لمبا سا پستول تھا:

"آپ لوگ اگر اپنی خیریت چاہتے ہیں سٹین گنیں وغیرہ گرا کر ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" آفیسر گرجا۔

"ہم تو صرف اپنے ملک کی خیریت چاہتے ہیں۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"لیکن ملک کی خیریت چاہنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟" وہ بھنا اٹھا۔

"اسے آپ انوکھا طریقہ کہہ سکتے ہیں۔" فاروق گنگنایا۔

عین اسی وقت ایک فائر اور ہوا، گولی اس لمبے آفیسر کے پستول کی نالی پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا، اسی وقت محمود، فاروق اور فرزانہ سٹین گنیں اٹھا چکے تھے۔

"اب آپ لوگ ہاتھ اٹھا دیں۔" محمود بولا۔

"بالکل اسی طرح جس طرح ابھی ہم اٹھائے کھڑے تھے۔" فاروق مسکرا اٹھا۔

"وقت بہت نازک ہے۔ ان لوگوں کو جلد از جلد باندھ دو۔"

"جی بہت بہتر۔"

محمود کیبن میں گیا۔ کیبن کی دیوار سے ریشم کی ڈوری کا ایک لچھا لٹک رہا تھا۔ اس رسی کی مدد سے انھوں نے ان لوگوں کو باندھا اور کیبن میں پہنچا دیا، ایسے میں انسپکٹر جمشید بولے:

"دیکھیے بھئی۔ بات یہ ہے کہ بہت مجبور ہو کر یہ اقدام کرنا پڑا، یہاں کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اپنے اجازت نامے کو جیب میں دیکھنے کا خیال نہیں آیا۔ ورنہ آپ لوگوں کو اس مرحلے سے نہ گزرنا پڑتا۔ ہمارا خیال ہے کہ بیگال کی جماعت ایم آئی پی ہمارے

اس مرکز کو اڑانے کی سازش کر چکی ہے۔ بلکہ شاید مرکز تک پہنچ بھی چکی ہے۔ اگر ہم یہ قدم نہ اٹھاتے تو آپ لوگ ہمیں کسی صورت بھی آگے جانے کی اجازت نہ دیتے۔ امید ہے، معاف فرمائیں گے۔ آپ کو چند گھنٹے تک اسی حالت میں رہنا ہو گا۔ مہربانی فرما کر آپ یہ بتا دیں کہ ہم مرکز تک کس طرح پہنچیں۔"

"تت۔ تو کیا آپ واقعی انسپکٹر جمشید ہیں۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔"

"تب پھر سنیے۔ آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔" لمبے آفیسر نے کہا۔

"کیا مطلب۔ میرا کون سا خیال غلط ہے۔"

"یہ کہ ایٹمی پلانٹ تک بیگال کی جماعت کے آدمی پہنچ چکے ہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"اس طرح کہ اصل پہرہ اندر شروع ہوتا ہے۔ ریگستان کے ارد گرد یہ خار دار تاروں کی دیوار دیکھ رہے ہیں آپ، اوّل تو اس دیوار کو عبور کرنا ہی بہت مشکل ہے۔ پھر اندر جا کر ملٹری کا زبردست پہرہ ہے۔ مرکز تک تو کوئی پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔ طیارہ شکن توپیں بم برسانے والے جہازوں کے لیے ہر وقت تیار رکھی جاتی ہیں۔ لہذا کوئی جہاز ادھر کا رُخ

کرتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ کسی بھی مشکوک
آدمی کے اندر جانے کا کوئی امکان نہیں۔ اور نہ کوئی آج
کل میں گیا ہے۔"

" آپ ایم آئی پی کے بارے میں شاید کچھ بھی نہیں جانتے۔
فرض کیا۔ ہم ہی ایم آئی پی کے کارکن ہیں۔ تو کیا ہم اب
اندر داخل نہیں ہو رہے۔"

" لیکن آگے پھر چیکنگ ہو گی اور یہاں کی نسبت زیادہ زبردست
ہو گی۔"

" اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے، کیونکہ آگے ان کے لیے پھر
ٹیڑھا مرحلہ آ رہا تھا۔

" خیر۔ دیکھا جائے گا۔ آپ تو یہ بتائیے ۔ ہم ریگستان کا
سفر کس طرح کریں؟"

" مرکز تک آنے جانے کے لیے ایک خاص جیپ تیار کی گئی
ہے۔ اس کے ٹائر اس قسم کے بنائے گئے ہیں کہ ریت پر
چل سکتے ہیں۔ کیبن کے دوسری طرف جیپ موجود ہے۔
اس میں بیٹھ کر چلے جائیں۔ اور مہربانی فرما کر ہمیں کھول
دیں۔"

" آپ کو کھول دیں۔ تاکہ آپ پھر ہمارے راستے کی دیوار
بن جائیں۔"

" نہیں۔ اب ہمیں یقین آگیا ہے کہ آپ واقعی انسپکٹر جمشید ہیں۔"

" نہیں بھئی۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوں،
کیا خبر آپ کیا چال چل جائیں۔"

" ہوں، جیسے آپ کی مرضی۔ ملک اور قوم کے لیے ہم اس
طرح بندھے پڑے رہنا بھی فخر کے قابل خیال کرتے ہیں۔"

" شکریہ۔ آپ کا نام؟"

" کیپٹن جمالی۔"

" ہم کوشش کریں گے۔ آپ کو زیادہ دیر کے لیے نہ بندھا رہنا
پڑے۔ آؤ بھئی۔"

وہ کیبن کے پچھلی طرف آئے، یہاں عجیب و غریب سے
ٹائروں والی ایک لمبی سی جیپ موجود تھی، وہ اس میں بیٹھ گئے
اور انسپکٹر جمشید جیپ آگے بڑھانے لگے:

" لیکن ابا جان! ہم اگلی حفاظتی چوکی پر کیا کریں گے۔"

" پتا نہیں کیا کریں گے۔ یہ تو موقعے اور محل کی بات ہے۔"
انھوں نے منہ بنایا۔

" اس سے تو یہی بہتر تھا کہ ہم فوج ساتھ لے آتے۔" فاروق
بولا۔

" بھئی یہ الجھن اس لیے پیش آئی ہے کہ اجازت نامہ اِدھر اُدھر
ہو گیا ہے۔ اب ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ جا کر پہلے اجازت نامہ

لائیں اور پھر مرکز تک پہنچیں۔ اس وقت تک تو نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"تو پھر اللہ کا نام لے کر بڑھے چلیں۔" محمود نے فوراً کہا۔

"ہاں! یہی تو کر رہا ہوں۔" انھوں نے مُسکرا کر کہا۔

"یار جمشید۔ نہ جانے کیا بات ہے، اب میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا ہے۔" خان رحمان بے چین ہو اُٹھے۔

"یہ نشانی اس بات کی ہے کہ تمھارا کام شروع ہونے والا ہے۔"

"تب تو میرا کام بھی شروع ہونے والا ہے۔" پروفیسر داؤد ہنسے۔

"اس کا مطلب ہے، آپ کا دل بھی دھڑک رہا ہے۔ خیر۔ انکل۔ آپ فکر نہ کریں۔ کام شروع ہونا کوئی بُری بات نہیں۔ بس ہمارا کام تمام نہ ہو۔" محمود بولا۔

"کام تمام ہو دشمنوں کا۔" فارُوق نے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں کہا، پھر بولا:

"یہ جیپ بھی عجیب ہے۔ بالکل ریگستان کے اونٹ کی طرح چل رہی ہے۔ اونٹ کو ہی لے لیں۔ کتنا پُرانا جانور ہے۔ آج بھی ریگستانوں میں اس پر سواری کی جاتی ہے، صرف ریگستانوں میں ہی نہیں۔ شہروں میں بھی بار برداری کے کام آتا ہے۔ حالانکہ کہا جاتا ہے، اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔" فارُوق روانی کے عالم میں کہتا چلا گیا۔

"ہے کوئی تک۔ کس قدر بے تکی گفتگو کی۔ بلکہ میں تو یہاں

تک کہہ سکتی ہوں کہ بے کل گفتگو کی۔" فرزانہ نے جھنجلا کر کہا۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ فارُوق کی بات کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔" محمود شوخ لہجے میں بولا۔

"یہ کہنا چاہتی ہے یا نہیں، تم کیوں نہیں کہہ لیتے۔" فارُوق نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"ذرا موقع ملا نہیں اور یہ شروع ہوئے نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"تو یہ ہمارا قصور تو نہ ہُوا ابا جان۔ موقعے کا قصور ہوا۔" فارُوق مسکرایا۔

"اور ابھی آپ خود یہ بات کہہ چکے ہیں۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"کیا بات کہہ چکا ہوں۔" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"یہ کہ موقع محل دیکھ کر کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔"

"وُہ قدم اٹھانے کی بات ہے، بے تکی ہانکنے کی بات نہیں۔" خان رحمان بولے۔

"سچ بات تو یہ ہے کہ انھوں نے تم دونوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔" پروفیسر داؤد بھرپور انداز میں مسکرائے۔

"تو پھر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ محفوظ آپ بھی نہیں رہے۔" خان رحمان بھلا کب خاموش رہنے والے تھے۔

ابھی ان کے چہروں سے مسکراہٹیں غائب نہیں ہوئی تھیں کہ ایک دُوسری خار دار تاروں والی دیوار نظر آنے لگی ۔ اس کے چاروں طرف مسلّح فوجی کھڑے تھے ۔

صحرائی جیپ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ ذرا بھی پریشان نظر نہیں آ رہے تھے ، کیونکہ اس جیپ کو اچھی طرح پہچانتے تھے ۔ لیکن جونہی وُہ دروازے کے قریب پہنچے ۔ اور جیپ سے نیچے اُترے ، سیکڑوں رائفلیں ان کی طرف اُٹھ گئیں —

نہیں !!!

"کون ہو تم لوگ ؟" ایک فوجی آفیسر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ۔

"مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں ۔"

"انسپکٹر جمشید ۔ اوہو ۔ آپ کے بارے میں تو ہمیں خاص ہدایات ہیں ۔ آپ جس وقت جی چاہے آ سکتے ہیں ، مہربانی فرما کر اپنے کاغذات دکھائیے ۔"

"افسوس ! میں کاغذات دکھانے کے قابل نہیں ۔"

"کیوں ۔ خیر تو ہے ؟"

"یہاں آنے کے چکر میں کاغذات اِدھر اُدھر ہو گئے ۔"

"اس صورت میں آپ آگے نہیں بڑھ سکتے ، یہیں سے واپس ہو جائیں اور کاغذات لے کر آئیں ۔"

"افسوس ! ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ۔ میں اس مرکز کو تباہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں! میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ پیش آنے والے واقعات خطرے کی نشان دہی کر رہے ہیں۔"

"اس کے باوجود جب تک آپ اپنے بارے میں ثبوت پیش نہیں کریں گے، آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

"مجھے ڈاکٹر فوزی سے ملا دیں۔ یا کم از کم ان کے اسسٹنٹ تک پہنچا دیں۔ میں ان کا اطمینان کرا دوں گا۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ ہم شناختی کارروائی کے بغیر کسی کو بھی آگے نہیں جانے دے سکتے، ہمیں اس کی اجازت ہے ہی نہیں۔ ارے مگر۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں حیرت جھلک اُٹھی۔

"کیا بات ہے؟" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

"کاغذات کے نہ ہوتے ہوئے آپ یہاں تک بھی کس طرح آگئے۔ کیپٹن جمالی نے آپ کو کس طرح آگے آنے کی اجازت دے دی۔"

"ان باتوں میں حد درجہ قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ فون پر ڈاکٹر صاحب سے بات کر لیں، ان کے نائب سے بات کر لیں۔ اگر وہ اجازت دے دیتے ہیں تو اس صورت میں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا

چاہیے۔" انسپکٹر جمشید چلا اُٹھے۔

"ہوں! خیر۔ میں یہ کیے دیتا ہوں، لیکن جانتا ہوں، پروفیسر ڈار مجھے زبردست جھاڑ پلائیں گے۔"

"نہیں پلائیں گے۔ میں بھی جانتا ہوں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انسپکٹر جمشید کے میک اپ میں اس وقت کوئی ملک دشمن ہمارے سامنے کھڑا ہو۔" آفیسر بولا۔

"ہاں! ہو سکتا ہے، لیکن آپ پہلے ہمارا اچھی طرح جائزہ لے لیجیے گا۔ اگر ہم میک اپ میں ہوں تو پھر آگے جانے کی اجازت دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پہلے میں پروفیسر ڈار سے بات کر لوں۔ آپ اسی حالت میں کھڑے رہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے اور ملٹری آفیسر دروازے کی طرف مُڑ گیا۔

"کیا اُلجھن پیش آئی ہے۔ اجازت نامہ بھی آج ہی ادھر اُدھر ہونا تھا۔" انسپکٹر جمشید جلا اُٹھے۔

"اگر پروفیسر اور ڈاکٹر صاحب نے مُلاقات کی اجازت نہ دی تو کیا ہوگا ابا جان۔"

"بھئی وہی ہوگا جو خدا کو منظور ہوگا۔" خان رحمان نے کندھے اُچکائے۔

"اگر ہم یہاں سے واپس جا کر اجازت نامہ لائیں تو چھ گھنٹے لگ جائیں گے ۔ اور چھ گھنٹوں میں نہ جانے یہاں کیا کچھ ہو جائے۔"
محمود بڑبڑایا۔

"اور ہم اتنے فوجیوں کی نگرانی کے ہوتے ہوئے اندر کی طرف دوڑ نہیں لگا سکتے۔" فرزانہ بولی۔

"کاش! ہم ایک آدھ سلیمانی ٹوپی ہی ساتھ لے آتے۔"
فاروق نے منہ بنایا۔

اسی وقت آفیسر ان کی طرف آتا نظر آیا:

"مجھے افسوس ہے جناب! پروفیسر ڈار نے اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ڈاکٹر فوزی صاحب سے اس سلسلے میں بات کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ ان دونوں کی ڈیوٹی ختم ہونے میں چند منٹ باقی ہیں ۔ چند منٹ بعد وہ یہاں سے رخصت ہو جائیں گے ۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب ملاقات کا وقت یوں بھی نہیں ہے ۔ لہذا آپ کل آئیے گا اور آتے ہوئے اجازت نامہ ساتھ لائیے گا۔"

"محمود ۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔" فرزانہ گلا پھاڑ کر بولی اور ساتھ ہی ایک زور دار طمانچہ محمود کے گال پر دے مارا۔

محمود کا منہ گھوم گیا ۔ اس نے اتنا زور دار طمانچہ زندگی میں

شاید ہی کبھی کھایا ہو گا ۔ منہ غصے سے سرخ ہو گیا، فرزانہ یوں بھی اس سے عمر میں چھوٹی تھی ۔ اور پھر اس نے کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی تھی، نہ ہی یہ بدتمیزی کرنے کا وقت تھا، لہذا اسے غصہ آنا قدرتی بات تھی ۔ نتیجہ یہ کہ اس نے بھناہٹ کے عالم میں اپنا دایاں ہاتھ پوری قوت سے فرزانہ کے سر کی طرف گھما ڈالا ۔

"ارے ارے ۔ یہ کیا ۔ تم لوگوں کا دماغ تو نہیں چل گیا۔"
انسپکٹر جمشید چلا اٹھے۔

ادھر فرزانہ محمود کے ہاتھ سے بچنے کے لیے یک دم نیچے بیٹھ گئی ۔ محمود کا ہاتھ فاروق کی گردن پر لگا اور اس زور سے لگا کہ چند لمحے کے لیے تو اسے زمین اور آسمان گھومتے محسوس ہوئے ۔ اس نے سر کو ایک زور دار جھٹکا دیا اور محمود پر جھپٹ پڑا ۔ محمود نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور فرزانہ کی طرف لپکا، فرزانہ بدک کر بھاگی اور اس کا رخ اسی آفیسر کی طرف ہو گیا جس سے ان کی بات چیت ہوئی تھی:

"اوہو! کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔"

ادھر ملٹری آفیسر اور دوسرے نگرانوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے ۔ فرزانہ سب سے آگے تھی اور انتہائی تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی ۔ اس کے پیچھے محمود تھا اور پھر فاروق ۔

اب انسپکٹر جمشید بھی نہ رُک سکے ۔ ارے ارے ۔ کر کے ان کے
پیچھے دوڑ پڑے ۔ پھر بھلا خان رحمان اور پروفیسر داؤد کس طرح
رک سکتے تھے۔

فرزانہ چند سیکنڈ میں ہی آفیسر کے نزدیک پہنچ گئی ۔
دوڑتے دوڑتے مڑ کر جو دیکھا تو محمود کو اپنے سر پر پایا ،
ارے باپ رے کہہ کر ملٹری آفیسر کے پاس سے نکلتی چلی گئی ،
اسی وقت رائفلوں کے چھتیانے کی آوازیں گونج اٹھیں۔ سیکڑوں
رائفلیں ان پر گولیاں برسانے ہی والی تھیں کہ ملٹری آفیسر
پوری طاقت سے چلّا اُٹھا :

" ٹھہرو ۔ میں نے ان لوگوں کو پہچان لیا ہے ۔ یہ انسپکٹر جمشید
اور ان کے ساتھی ہی ہیں ۔ گولی نہ چلانا "

نگرانوں کے ہاتھ رُک گئے ، وُہ ساکت کھڑے رہ گئے ۔
ادھر آفیسر بھی اب ان کے پیچھے دوڑ پڑا تھا ، اس وقت تک
پروفیسر داؤد بھی اس کے پاس سے گزر چکے تھے ۔

تاروں کی باڑ والا دروازہ عبور کرتے ہی انھوں نے ایک
عظیم الشان عمارت دیکھی ۔ وُہ پتھروں کی بنی ہوئی تھی ۔ اور
بہت پھیلاؤ رکھتی تھی ۔ اس کا دروازہ کسی قلعے کے دروازے
جیسا تھا اور اس دروازے پر بھی آٹھ ملٹری جوان سنگینیں لگی
رائفلیں لیے کھڑے تھے ۔ اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ کر انھوں

نے سنگینوں کا رخ ان کی طرف کر دیا ۔

" ٹھہرو بھئی ۔ گولی نہ چلانا اور نہ سنگینوں سے ان پر وار
کرنا " ملٹری آفیسر چلّایا۔

" شکریہ آفیسر ۔ آپ کا نام کیا ہے " پروفیسر داؤد بولے۔

" مجھے پرویز بخاری کہتے ہیں "

" بہت خوب ۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ہمیں پہچان لیا ۔ ورنہ
بہت اُلجھن ہوتی " فاروق خوش ہو کر بولا۔

" اور میں نے آپ لوگوں کو آپ کی اس حرکت سے پہچانا "
وہ بولا ۔

" کس حرکت سے ۔ آپ کے خیال میں ہم حرکتیں کرتے ہیں "
فاروق بولا۔

" بھئی چپ رہو ۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے "

" آئیے ۔ میں آپ کو پروفیسر ڈار کے پاس لے چلوں ۔ اوہو ،
مگر ۔ وُہ دونوں تو اس وقت رُخصت ہونے کے لیے اُٹھ بھی
چکے ہوں گے " اس نے گھڑی پر نظر ڈالی ۔

" تو پھر جلدی کریں "

اب وُہ ان سے آگے چلا ، وُہ تیزی سے اس کے پیچھے قدم
اُٹھانے لگے :

" اور یہ کام فرزانہ کی بدتمیزی نے دکھایا ہے " پروفیسر داؤد

خوش ہو کر بولے۔

"جی ہاں! اس بدتمیزی نے۔ جو میں نے کی بھی نہیں۔" فرزانہ نے شوخ آواز میں کہا۔

"گویا وہ فرضی بدتمیزی تھی۔ ارے مگر ہائیں۔ یہ۔ یہ تو۔ یہ تو۔" فاروق ہکلا کر رہ گیا۔ اس کی نظریں سامنے جم گئیں۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"ہاں ہاں۔ کہہ دو۔ یہ کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"افسوس! اب میں یہ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں کیوں۔ کیا ہوا۔"

"بخاری۔ یہ سب کیا ہے؟"

ایک گونج دار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ اب انھوں نے بھی سامنے دیکھا، فاروق پہلے ہی اس طرف دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے دیکھا۔ وہاں سُرخ و سفید رنگ والے ادھیڑ عمر کے دو آدمی کھڑے تھے۔

"یہ۔ یہ انسپکٹر جمشید ہیں سر!"

"لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ ان کے پاس اپنی شناخت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔" ان میں سے ایک بولا، یہ لمبے قد کا تھا۔

"جی ہاں۔ میں نے ضرور کہا تھا، لیکن اب انھوں نے اپنی

شناخت ثابت کر دی ہے، یہ واقعی انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی ہیں۔ میں اپنا اطمینان کر چکا ہوں۔"

"لیکن بخاری۔ اب ہمارے پاس ان سے ملاقات کا وقت نہیں رہا۔ انھیں چاہیے۔ کل آئیں۔" دوسرا بولا، یہ قدرے چھوٹے قد کا تھا۔

"افسوس! ہم کل نہیں آسکیں گے۔ آپ سے بات کرنے کا یہی وقت مناسب ہے۔ ایم آئی پی کے کارکنوں نے ہمارے اس ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے کا منصوبہ مکمل کر لیا ہے۔ ہم اس وقت بھی شاید آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں، وہ آتش فشاں پہاڑ جو کسی وقت بھی آگ اگلنا شروع کر سکتا ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ آپ یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں۔"

"ہمیں جو حالات پیش آئے، ان کی روشنی میں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ لوگوں کو ضرور وہم ہو گیا ہے۔ یہاں ہر طرح خیریت ہے۔ کوئی مشکوک آدمی گذشتہ ایک سال سے ادھر پھٹک بھی نہیں سکا۔"

"اس کے باوجود اگر ہم اپنا اطمینان کر لیں تو آپ کا کیا نقصان ہے۔"

" ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے ۔ کیا آپ لوگوں کے پاس
اطمینان کرنے کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے اجازت نامہ ہے ۔"
" افسوس ! جھگڑا تو اس اجازت نامے کے اِدھر اُدھر ہونے
کا ہی ہے ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔
" تب پھر ۔ آپ اجازت نامہ لے آئیں ، پھر ہمیں کوئی اعتراض
نہیں ہوگا ۔ ارے ۔" وہ کہتے کہتے چونک اٹھا ، پھر پروفیسر بخاری
کو گھورتے ہوئے بولے :
" ان لوگوں کے پاس اگر اجازت نامہ نہیں تھا تو پھر انھیں
اندر کیوں آنے دیا ۔"
" انھوں نے اپنی شناخت ایک اور طریقے سے کرائی تھی سر ۔
اور میں ان کے اس طریقے سے واقف ہوں ۔" پرویز بخاری بولا ۔
" کک ۔ کیا مطلب ؟"
" سر ! اس کے بتانے میں وقت ضائع ہوگا ۔ ان لوگوں
کا خیال ہے ، وقت بہت نازک ہے ۔"
" ان لوگوں کو وہم ہو گیا ہے ۔ انھیں باہر نکال دو ۔ یہ
کل اجازت نامہ لے کر آ جائیں اور اپنا اطمینان کر لیں ۔ آؤ
ڈار چلیں ۔" لمبے نے کہا ۔
دونوں دروازے کی طرف مُڑے ۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید سرد
آواز میں بولے :

" آپ دونوں اس طرح نہیں جا سکتے ۔"
نہ جانے ان الفاظ میں کیا تھا ۔ دونوں چونک کر مڑے ۔
انھوں نے دیکھا ، انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا ۔
اور اس کی نالی کا رُخ ان دونوں کی طرف تھا ۔
" یہ ۔ یہ کیا ۔ بخاری ۔ یہ کیا بدتمیزی ہے ۔" ڈاکٹر فوزی
غرایا ۔
" انسپکٹر جمشید ۔ خُدا کے لیے پستول جیب میں رکھ لیں ۔
حالات کو اور خراب نہ کریں ۔" بخاری نے درخواست کی ۔
" میں پستول جیب میں رکھنے کے لیے تیار ہوں ۔ آپ واپس
پلٹ آئیں ۔ اور اطمینان سے میری بات سُن لیں ۔"
" تم سُن رہے ہو بخاری ۔ آج کا دن تمھاری ملازمت کا
آخری دن ہے ۔"
" لل ۔ لیکن سر ۔ مم ۔ میں نے کیا کیا ہے ۔" بخاری کانپ
اُٹھا ۔
" یہی کیا کم ہے کہ تم ان لوگوں کو اندر لے آئے ہو ، جبکہ
ان کے پاس کوئی اجازت نامہ نہیں تھا ۔"
" تو پھر ایسا کر لیتے ہیں ، آپ تشریف لے جائیں ۔ ہم ان
لوگوں کو چیک کرا دیتے ہیں ۔" پرویز بخاری نے کہا ۔
" نہیں ۔ ہرگز نہیں ۔ کیا خبر ۔ یہ کون لوگ ہیں ۔ ہر کام سے

پہلے اب ان لوگوں کو باہر نکالنا ہوگا۔" پروفیسر ڈار نے غرا کر کہا۔

"افسوس! یہ نہیں ہو سکے گا۔ اگر آپ لوگوں نے دروازے کی طرف ایک قدم بھی اٹھایا تو ہم گولی چلا دیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ اس وقت تک خان رحمان بھی پستول نکال چکے تھے۔

"بخاری۔ شاید ہم پاگل ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر فوزی چلایا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ اتنی زور سے نہ بولیں۔ آپ کی مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ محمود۔ اپنا کام کرو۔"

"جی بہتر!" اس نے کہا اور فوراً دروازے پر پہنچ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ اندر سے بند کر چکا تھا۔

"یہ کیا۔" پروفیسر ڈار نے چیخ کر کہا۔

"ہمیں بہت افسوس ہے ڈار صاحب۔ ابھی آپ نہیں جا سکیں گے۔ کچھ دیر اور رکنا پڑے گا۔"

"شاید ہم پاگل ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر فوزی نے پاؤں پٹخے۔

"اگر آپ اطمینان اور سکون سے ہماری بات سن لیں تو کچھ بھی نہیں ہوگا، کیا آپ اس ملک کے خیر خواہ نہیں ہیں۔"

"کیوں نہیں ہیں۔" پروفیسر ڈار نے بلند آواز میں کہا۔

"تو پھر خیر خواہی کا ثبوت دیں۔ ہمارے ساتھ شامل ہو کر پورے مرکز کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ کہیں کوئی گڑبڑ

تو نہیں ہے۔"

"ایسا کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ اور یہ کام کل بھی تو کیا جا سکتا ہے۔"

"جی نہیں! یہ کام ابھی اور اسی وقت شروع ہوگا۔"

"اور ہم آپ کے ماتحت نہیں ہیں۔ پرویز بخاری۔ ہم حکم دیتے ہیں، ان لوگوں کو گرفتار کر لیا جائے اور کل ہمارے آنے تک کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔"

"مم۔ میں۔ میں۔" بخاری ہکلایا۔

"بخاری صاحب۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب ہم اور وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ آپ ایسا کریں کہ ان دونوں صاحبان کو گرفتار کر لیں، تاکہ ہم اطمینان سے اپنا کام کر سکیں۔" انسپکٹر جمشید نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"جی کیا فرمایا۔ گرفتار کر لوں۔ مم۔ میں۔"

"ہاں آپ۔ اور کون گرفتار کرنے کے لیے آئے گا یہاں۔"

"لیکن کیوں گرفتار کر لوں۔ میں ان کے ماتحت ہوں۔ یہ اس پلانٹ کے انچارج ہیں۔"

"انھیں اس لیے گرفتار کیا جانا چاہیے کہ یہ ملک اور قوم کی بہتری کے لیے تھوڑا سا وقت قربان نہیں کر سکتے، آخر یہ کیسے خیر خواہ ہیں۔" خان رحمان زہریلے لہجے میں بولے۔

"وہ اس لیے، ان کے خیال کے مطابق یہاں کچھ گڑ بڑ نہیں ہے۔"

"اور میں کہہ رہا ہوں، گڑ بڑ ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لہٰذا ان حالات میں مُلک کی خاطر جان تک قربان کی جا سکتی ہے، وقت خرچ کرنا تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔" پروفیسر داؤد جلدی سے بولے۔

"یوں بات نہیں بنے گی۔ یہ دونوں حضرات ضد پر اڑ گئے ہیں۔ چیکنگ نہیں کرنے دیں گے، نہ چیکنگ کرنے میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ اس لیے فی الحال ان دونوں کو گرفتار کرنا ہی ہو گا۔"

"ایسا ہونے سے پہلے تم اس دُنیا میں نہیں رہے ہو۔" ڈاکٹر فوزی نے غرّا کر کہا۔

"ہم اس دُنیا میں رہیں یا نہ رہیں، اپنا کام تو کر ہی جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب۔ کیا میں آپ کے اور آپ کے نائب کے چہروں کا قریب سے جائزہ لے سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب!" دونوں ایک ساتھ چلّائے۔

اور انسپکٹر جمشید کے چہرے پر دل کش مسکراہٹ کھیل گئی، انھوں نے پُرسکون اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہا:

"میرا خیال ہے۔ ہمارے سامنے اصلی ڈاکٹر فوزی اور پروفیسر ڈار

نہیں کھڑے، ورنہ وہ تو یہاں گڑبڑ کا ذکر سُن کر ہی بوکھلا جاتے۔"

"نہیں!" پرویز بخاری اُچھل پڑا۔

اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

موت بھی کیا چیز ہے

چند سیکنڈ کے لیے موت کی خاموشی چھا گئی۔ ڈاکٹر اور
پروفیسر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھتے رہے،
آخر ڈاکٹر فوزی نے سرد آواز میں کہا:

"بخاری۔ اب معاملہ ہماری برداشت سے باہر ہے۔ اپنے
ساتھیوں کو بلاؤ اور ان لوگوں کو اسی وقت اُلٹا لٹکا دو۔ تاکہ معلوم
ہو جائے، یہ خود کون ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ
ہمارے ملک کے دشمن ہیں اور انسپکٹر جمشید وغیرہ کے میک اَپ
میں آئے ہیں۔"

"نہیں سر۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" پرویز بخاری بولا۔

"کیا نہیں ہو سکتا۔"

"یہ دشمن مُلک کے جاسوس نہیں ہیں۔ انھوں نے جو حرکت
کی ہے، وہ ان کے علاوہ کوئی اور کر ہی نہیں سکتا۔ یہ
سیکڑوں رائفلوں کے سامنے سے گزر کر اندر داخل ہوئے ہیں۔

اور یہ ایسا پہلے بھی کر چکے ہیں، یہ بات ان کے لیے نئی نہیں،
اگر آپ واقعی ڈاکٹر فوزی ہیں تو مہربانی فرما کر فوری طور پر
اپنے چہروں کی چیکنگ کی اجازت دیں، تاکہ یہ مسئلہ جلدازجلد
طے ہو جائے۔ اب تو مجھے خوف محسوس ہونے لگا ہے۔"

"تم۔ بخاری۔ ہمارے چہرے چیک کرو گے۔ میں تمھارا
کورٹ مارشل کراؤں گا۔"

"ضرور کرائیے گا سر، لیکن اپنی چیکنگ کے بعد۔" اس نے
فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"شکریہ مسٹر بخاری۔ اب میری جگہ پستول تم ان کی طرف
تان لو۔ اگر یہ لوگ میک اَپ میں نہ ہوئے تو میں ان سے معافی
مانگ لوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور
ساتھ ہی بخاری کا پستول اس کے ہاتھ میں نظر آیا۔۔۔

"بخاری تم اپنی موت کو آواز دے رہے ہو۔"

"کوئی بات نہیں سر۔ مُلک کے لیے جان حاضر ہے۔"

اب انسپکٹر جمشید ان کی طرف بڑھے۔ جونہی ان کے نزدیک
پہنچے۔ بہت زور سے اچھلے اور فرش پر گرے۔ ڈاکٹر فوزی
نے کوئی عجیب وار کیا تھا۔ وہ دیکھ بھی نہ سکے۔ ان کی
آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ انسپکٹر جمشید مکمل طور پر بے ہوش

ہو چکے تھے۔

"آؤ۔ ہمارے چہرے دیکھنے کے لیے اب کون آگے بڑھتا ہے۔"

وہ سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے اور آخر خان رحمان نے پستول جیب میں رکھتے ہوئے کہا:

"میں آگے بڑھوں گا۔"

"آؤ آؤ۔ تمھارا انجام بھی مختلف نہیں ہوگا۔" پروفیسر ڈار ہنسا۔

خان رحمان بے خوفی کے عالم میں جلدی جلدی قدم اٹھانے لگے۔ اور ان کے نزدیک پہنچ گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ اب ان کی طرف بغور دیکھ رہے تھے۔ جونہی خان رحمان ان کے نزدیک پہنچے۔ ڈاکٹر فوزی بجلی کی سرعت سے تڑپا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ خان رحمان کے پیٹ میں لگے، خان رحمان بالکل انسپکٹر جمشید کے انداز میں اچھلے اور فرش پر ڈھیر ہوگئے، وہ بھی بے ہوش ہو چکے تھے۔ شاید یہ کوئی بالکل نیا داؤ تھا۔

محمود، فاروق اور فرزانہ دھک سے رہ گئے۔ ادھر پرویز بخاری کا برا حال تھا۔

"اب تم کیا کہتے ہو بخاری۔"

"مم۔ میں۔ میں کیا کہوں سر۔"

"کیا تم ہمارے چہروں کو چیک نہیں کرو گے۔"

"نن۔ نہیں۔ سر۔ میں۔ میں نہیں کر سکتا۔"

"لیکن میں تمھیں ضرور چیک کروں گا۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزی اس کی طرف بڑھا۔

"کک۔ کیا مطلب۔" بخاری خوف زدہ آواز میں بولا۔

ڈاکٹر فوزی نے کوئی جواب نہ دیا، ایک ایک قدم بخاری کی طرف بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا:

"کیا خیال ہے بخاری۔ گولی نہیں چلاؤ گے مجھ پر۔" ڈاکٹر فوزی طنزیہ لہجے میں بولا۔ انھوں نے صاف محسوس کیا۔ بخاری تھر تھر کانپ رہا تھا۔ شاید ان کے والد اور انکل کا انجام دیکھ کر۔ پروفیسر داؤد کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اچانک ڈاکٹر فوزی حرکت میں آیا اور بخاری کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ دے مارا۔ پستول اچھلا اور محمود کے سر پر سے ہوتا اس کی کمر کی طرف جا گرا۔ ساتھ ہی بخاری کی گردن پر ڈاکٹر فوزی کا مکا لگا اور وہ دھڑام سے گرا۔

ڈاکٹر فوزی نے ہاتھ جھاڑ دیے اور مسکرا کر پروفیسر ڈار کی طرف مڑتے ہوئے بولا:

"کیسی رہی پروفیسر؟"

"بہت خوب سر۔ آپ نے کمال کر دیا۔ ایک ایک ہاتھ میں انھیں

ڈھیر کر دیا، لیکن سر ابھی ان میں سے یہ باقی ہیں۔"

"ان کا کیا ہے۔ یہ تو بچے ہیں اور وہ بوڑھا ہے۔ بوڑھے میں تو شاید ہمت ہی نہیں آگے بڑھنے کی۔ ان تینوں کا حلیہ میں ایک منٹ میں بگاڑ کر رکھ دوں گا۔"

"ہمت ہو نہ ہو، میں اپنے ملک پر قربان ہونے کا جذبہ ضرور رکھتا ہوں۔ لو اپنا ہاتھ مجھ پر بھی آزما لو۔"

یہ کہہ کر پروفیسر داؤد نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ محمود بول اٹھا:

"نہیں! انکل پروفیسر داؤد، اس کی ضرورت نہیں، ابھی ہم باقی ہیں، ہمارے گرنے کے بعد آپ ضرور قدم آگے بڑھائیے گا۔"

"اوہو، تو تم بھی لڑو گے۔ کیا تم نے اپنے بڑوں کا انجام نہیں دیکھا۔" پروفیسر ڈار ہنسا۔

"ہاں! دیکھا ہے۔ ہم انجام کی پروا نہیں کرتے، ملک کی خاطر کسی قربانی سے پیچھے نہیں ہٹتے، یہ بات ہمارے بارے میں ہمارے دشمن بھی جانتے ہیں، لیکن شاید تم دونوں پہلی بار ہمارے ملک میں آئے ہو۔ اس لیے تم ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔"

"ہاں! یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ ہم واقعی تم لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ پہلی بار یہاں آئے ہیں، لیکن جو کام ہمیں سونپا گیا تھا، وہ ہم مکمل کر چکے

ہیں اور آج یہاں آخری بار آئے تھے۔ آج یہاں سے جانے کے بعد پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

"گویا تم ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے کا کام مکمل کر چکے ہو۔"

"ہاں ننھے دوستو۔ بالکل یہی بات ہے۔" پروفیسر ڈار مسکرایا۔

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔ اس کا مطلب تھا، وہ عین وقت پر یہاں پہنچے تھے:

"تو اس منصوبے کے انچارج بھی آپ ہی ہیں؟" فرزانہ نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"نہیں۔ ہمارا کام تو بس اتنا تھا کہ ڈاکٹر فوزی اور پروفیسر ڈار کی جگہ لے کر اپنا کام کر گزریں اور بس۔ منصوبہ سازی کسی اور نے کی تھی۔ منصوبے پر عمل یہاں کے باس نے کرایا تھا۔ اس ملک کی حد تک ہم اس کے ماتحت ہیں، یہاں سے رخصت ہونے کے بعد اس کی ماتحتی سے نکل جائیں گے۔"

"بہت خوب۔ تو پھر آؤ۔ ہمارا انجام بھی ان جیسا کر ڈالو۔ ہم ان حالات میں ہوش میں رہ کر کیا کریں گے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔ تم تو چٹکیوں کی مار ہو۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزی پھر آگے بڑھا، ایسے میں محمود بول اٹھا:

"پرانا حربہ۔"

اور وہ تینوں تین مختلف سمتوں میں بٹ گئے، ساتھ ہی

انھوں نے محسوس کیا کہ پروفیسر ڈار اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا:

"ابھی تک آپ کے ساتھی پروفیسر نے لڑائی بھڑائی میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔"

"تو پروفیسر داؤد نے بھی تو کوئی حصّہ نہیں لیا۔"

"اوہ سمجھ گئے ۔ مطلب یہ کہ یہ لڑائی بھڑائی کے کاموں سے واقف نہیں۔"

"ہاں ! یہی بات ہے ، لیکن تم تینوں کے لیے تو میں اکیلا ہی بہت کافی ہوں۔"

"ہاں یہ تو خیر ٹھیک ہے ۔"

اسی وقت ڈاکٹر فوزی محمود کی طرف جھپٹا ۔ محمود خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹنے لگا ۔ ڈاکٹر فوزی بھیانک انداز میں ہنسا اور تیزی سے آگے بڑھا ۔ یہاں تک کہ محمود دیوار سے جا ٹکرایا۔ اب وہ محمود کے عین سر پر پہنچ چکا تھا ۔ اچانک کوئی چیز پورے زور سے ڈاکٹر فوزی کی کمر پر لگی ۔ ساتھ ہی محمود اپنی جگہ سے کھسک لیا اور ڈاکٹر فوزی دھڑام سے دیوار سے ٹکرایا۔

پروفیسر داؤد اور پروفیسر ڈار کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ۔ یہ اس لڑاکے نے پہلی چوٹ کھائی تھی ۔ محمود ، فاروق اور فرزانہ اب پھر تین مختلف جگہوں پر کھڑے تھے ۔ اب جو ڈاکٹر فوزی مڑا تو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار صاف دیکھے جا سکتے تھے۔

"آئیے جناب آئیے ۔ ہم تو آپ کے استقبال کے لیے کب کے تیار ہیں۔" فاروق چہکا۔

"فکر نہ کرو ۔ آرہا ہوں ۔ تم دیکھو گے کہ میں تمھارے ساتھ کس قدر شاندار سلوک کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور فاروق پر چھلانگ لگا دی ، کیونکہ اس کی کمر پر سر کی ٹکر فاروق نے ہی ماری تھی ۔ اس بار وہ ایک ایک قدم آگے نہیں بڑھا تھا ۔ یک دم فاروق پر جا پڑا تھا ۔ مگر فاروق بھی شاید پہلے سے تیار تھا ۔ عین اسی وقت اس نے چھلانگ لگائی تھی ۔ اور گویا اس کے نیچے سے نکلتا دُور چلا گیا تھا ۔ ڈاکٹر فوزی اپنی جھونک میں چند قدم آگے بڑھ گیا ۔ اسی وقت فرزانہ کی ٹانگ چل گئی اور وہ ایک بار پھر گرا۔

اس مرتبہ پروفیسر داؤد اور پروفیسر ڈار کی آنکھیں پہلے سے کہیں زیادہ پھیلتی نظر آئیں۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید نے ایک جھرجھری لی ۔ ساتھ ہی آنکھیں کھول دیں ، انھوں نے دیکھا ، ڈاکٹر فوزی اٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا اور محمود ، فاروق اور فرزانہ تین مختلف سمتوں میں کھڑے اسے اٹھتے دیکھ رہے تھے ، وہ مسکرا دیے ۔ لڑائی کا یہ انداز وہ پہلے بھی کئی بار آزما چکے تھے ، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ دشمن ان میں سے صرف ایک پر حملہ آور ہو سکتا تھا ۔ باقی دو پر

نہیں، ادھر وہ حملہ آور ہوتا، ادھر باقی دو اس کی خبر لینے کی تیاری کر لیتے۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر فوزی ان میں سے کسی پر پھر جھپٹ پڑتا، انسپکٹر جمشید بول اٹھے:

"نہیں بھئی۔ اب ان بچوں سے لڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک بار پھر میدان میں موجود ہوں۔"

ان کی آواز سن کر وہ چونک اُٹھے، فوراً ہی فرزانہ بولی:

"اس سے ہمیں ہی نبٹ لینے دیجیے ابا جان۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا۔"

"نہیں بھئی۔ اس نے مجھ پر قرض چڑھا دیا ہے۔ وہ بھی تو اتارنا ہے۔ ہٹ جاؤ پیچھے۔"

یہ کہہ کر وہ سیدھے کھڑے ہو گئے اور ڈاکٹر فوزی کے مقابل ڈٹ گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ دیوار سے جا لگے۔ پروفیسر داؤد اور پروفیسر ڈار پہلے ہی دیوار سے چپکے ہوئے تھے۔ اور اسی وقت خان رحمان نے بھی آنکھیں کھول دیں:

"ارے۔ مجھے کیا ہوا تھا۔" وہ گھبرا کر بولے۔

"آپ کو ڈاکٹر فوزی ہو گیا تھا انکل۔ ہمارے پاس چلے آئیے۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"اوہ ہاں۔ واقعی۔" وہ بولے اور جلدی سے ان کے نزدیک آ گئے، پھر پرویز بخاری بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

عین اسی وقت انسپکٹر جمشید ڈاکٹر فوزی پر جھپٹے۔ اس نے پھر وہی داؤ آزمانے کی کوشش کی، لیکن اب انسپکٹر جمشید اس کے داؤ سے خبردار ہو چکے تھے، بلا کی تیزی سے گھوم گئے۔ ڈاکٹر فوزی کے دونوں ہاتھ ان کی کمر پر لگے، ساتھ ہی اس کے دونوں ہاتھ ان کے ہاتھوں میں آ گئے اور انھوں نے اسے سر کے اوپر سے لاتے ہوئے فرش پر اس طرح پٹخ دیا جیسے دھوبی کپڑے کو پٹختا ہے۔

ڈاکٹر فوزی کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی اور وہ ساکت ہو گیا؛ تاہم بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں اب چھت پر جمی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے جاگتے میں سو گیا ہو۔

"اٹھیے جناب ڈاکٹر فوزی۔ لیٹے ہوئے کیا کر رہے ہیں؟" فاروق گنگنایا۔

"اب یہ نہیں اٹھے گا۔ بے چارے کی ریڑھ کی ہڈی جواب دے گئی ہے۔"

"ارے باپ رے۔" فاروق بوکھلا کر بولا۔

"مسٹر ڈار۔ اب تم کیا کہتے ہو؟" انسپکٹر جمشید اس کی طرف مڑے۔

"کک۔ کیا مطلب!"

"مطلب یہ کہ کیا تم بھی اپنی ریڑھ کی ہڈی تڑوانا پسند کرو گے۔"

"ن۔نہیں۔" وہ ہکلایا۔

"تو پھر بتاؤ۔ ڈائنامیٹ کہاں کہاں فٹ کیے گئے ہیں۔ اور وہ کس وقت پھٹیں گے؟"

"پہلے ہمیں اس عمارت سے باہر لے چلو، پھر بتائیں گے۔" پروفیسر ڈار نے کہا۔

"نہیں۔یہیں رہتے ہوئے بتانا ہو گا۔"

"ہرگز نہ بتانا پروفیسر کملان۔ جب تک یہ ہمیں یہاں سے نکال نہ لے جائیں۔"

"تو اس کا نام کملان ہے۔ واہ اچھا نام ہے۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"چپ رہو فاروق۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید ڈاکٹر فوزی کی طرف مڑے:

"تو بولنے کی ہمت تم میں ہے۔ یہ اچھی بات ہے، اب میں تم سے بات کروں گا۔ جلدی بتاؤ۔ ڈائنامیٹ کہاں کہاں فٹ ہیں۔"

"نہیں بتائیں گے۔"

"تب پھر میں تم دونوں کو اس کمرے میں بند کر کے پوری

عمارت کو خالی کرا دیتا ہوں۔"

"ضرور کرا دو۔ موت تو ہمارا مقدر یوں بھی بن چکی ہے، تم لوگ کون سا پھانسی سے کم سزا دو گے۔"

"لیکن بم کے ذریعے مرنا شاید بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں! اس طرح تو ایک سیکنڈ میں خاتمہ ہو جاتا ہے، پھانسی پانے میں دو منٹ تو لگ ہی جاتے ہوں گے۔"

"گویا تم نہیں بتاؤ گے۔"

"نہیں۔تم سے جو بن پڑتا ہے، کر گزرو۔"

"ٹھیک ہے۔ مسٹر پرویز بخاری۔ ان دونوں کو اسی کمرے میں بند کر دو۔ اور تمام عملے کو عمارت فوری طور پر خالی کرنے کا حکم دے دو۔ سب لوگ پہلی خاردار تار کی دیوار کے پاس پہنچ جائیں۔ اس سے ادھر نہ رکیں۔"

"اور آپ؟" بخاری نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم ڈائنامیٹ تلاش کریں گے۔ اس وقت تک تلاش کریں گے جب تک کہ مل نہ جائیں یا وہ پھٹ نہ جائیں، کیونکہ ہم اپنے عوام کو یہ اطلاع کس طرح دے سکتے ہیں کہ ہمارے ہوتے ہوئے ایٹمی مرکز کو پھٹنے سے نہیں بچایا جا سکا۔ ہم اس مرکز کے ساتھ ہی ختم ہونا پسند کریں گے، اپنی آنکھوں سے اسے

تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔"

"بہت خوب ـ بہت اچھا فیصلہ ہے ـ ان حالات میں، مَیں یہ بات بتا سکتا ہوں کہ تمام بموں کے پھٹنے میں کتنی دیر ہے ـ سنو ـ کُل چار بم فِٹ کیے گئے ہیں ـ چاروں کا کنکشن ایک ہی ہے ـ گویا چاروں ایک ہی وقت میں پھٹیں گے ـ اور ان کے پھٹنے میں صرف اکتیس منٹ باقی ہیں۔" ڈاکٹر فوزی نے گھڑی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اکتیس منٹ۔" انسپکٹر جمشید بوکھلا اُٹھے، پھر پرویز بخاری کی طرف مُڑے:

"مسٹر بخاری ـ اتنی دیر میں آپ لوگ عمارت خالی کر کے خار دار تاروں کی پہلی دیوار تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"عمارت خالی ہونے میں تو صرف تین منٹ صرف ہوں گے جناب، لیکن دیوار تک شاید ہی پہنچا جا سکے۔"

"خیر ـ یہاں سے جس قدر دُور بھی پہنچ سکیں، بہتر ہے، تو پھر آپ عمارت خالی کرا دیں اور دوڑ لگوا دیں۔"

"اور ـ اور آپ یہیں رہیں گے؟"

"ہاں ہمارا فیصلہ اٹل ہے ـ ہمارے ساتھ یہ دونوں بھی یہیں رہیں گے ـ محمود، فاروق ـ تم ان دونوں کو باندھ دو ـ تاکہ یہ فرار نہ ہو سکیں۔"

"جی بہتر۔" انھوں نے کہا اور ان کی طرف بڑھے ـ پرویز بخاری اس وقت تک دوڑ لگا چکا تھا ـ

"خان رحمان ـ میری تم سے ایک درخواست ہے۔" انسپکٹر جمشید نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کہو ـ کیا بات ہے؟" خان رحمان بولے۔

"مہربانی فرما کر تم بھی فوجیوں کے ساتھ عمارت سے نکل جاؤ۔"

"کیوں ـ میں کیوں نکل جاؤں؟"

"ڈائنا میٹ تلاش کرنے میں پروفیسر صاحب کا یہاں رہنا تو ضروری ہے، لیکن تمھارا رہنا ضروری نہیں ـ لہذا تم چلے جاؤ ـ تین گھرانوں کی دیکھ بھال کے لیے ہم میں سے ایک تو بچ جائے۔"

"گھرانوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک اللہ تعالیٰ کافی نہیں جمشید۔" خان رحمان نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اوہ ـ خان رحمان ـ اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے ـ میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

"کچھ نہیں جمشید ـ میں ہرگز نہیں جاؤں گا ـ ملک کے لیے کیا تم ہی اپنی جان دے سکتے ہو ـ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ میں ایک ریٹائرڈ فوجی ہوں؟"

"میں جانتا ہوں ـ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم بہت ضدی ہو، خیر اب اس بات میں وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا ـ پروفیسر

صاحب مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کو تو ضرور یہاں سے بھیج دیتا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور تم کیا سمجھتے ہو۔ میں چلا جاتا۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"اچھا چلیے۔ اب بموں کی تلاش شروع کیجیے۔"

"کاش میں آتے ہوئے اپنے چند آلات لے آتا۔" پروفیسر داؤد نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر فوزی۔ یا جو کچھ بھی آپ کا نام ہے۔ ابھی بھی وقت ہے۔ بتا دیں کہ ڈائنا میٹ کہاں کہاں فٹ کیے گئے ہیں، اس صورت میں آپ دونوں کو یہاں سے زندہ لے جایا جائے گا، میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ ہم بھی اپنے منصوبے کو ناکام ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔"

"اچھا تمھاری مرضی۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

انھوں نے تلاش شروع کی۔ اس سلسلے میں پروفیسر داؤد کو تجربہ تھا۔ وُہ کمرے میں موجود آلات کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور پھر چند آلات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب انھوں نے ان کی مدد سے تلاش شروع کی۔ انسپکٹر جمشید اور خان رحمان ایک الگ سمت میں تلاش میں مصروف ہو گئے۔ محمود، فاروق اور

فرزانہ تینوں ایک تیسری سمت میں مُڑ گئے۔

عمارت میں اب دوڑتے قدموں کی آوازیں گونجنا شروع ہو گئی تھیں۔ گویا عملہ اور ملٹری والے عمارت کو افراتفری کے عالم میں خالی کر رہے تھے۔

وقت اب انھیں بہت تیزی سے گزرتا محسوس ہو رہا تھا۔ تین منٹ بعد عمارت میں موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ گویا اب اس پوری عمارت میں ان آٹھ افراد کے علاوہ کوئی نہیں رہا تھا۔

پروفیسر داؤد آلات کی مدد سے ڈائنا میٹ تلاش کرنے میں مصروف تھے اور وُہ آلات کی مدد کے بغیر دیکھتے پھر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وُہ ایٹمی آلات والے حصے میں پہنچ گئے۔ اس وقت تک دس منٹ گزر چکے تھے۔ اب جہاں بھی وہ جا رہے تھے۔ ڈاکٹر فوزی اور پروفیسر کملان کو ساتھ لے کر جا رہے تھے۔ ان دونوں کو نظروں سے اوجھل رکھنا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اب وُہ سب ایک ساتھ ڈائنا میٹ تلاش کر رہے تھے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ ڈاکٹر فوزی اور پروفیسر کملان کے چہروں پر بشاشت دوڑ رہی تھی۔ آخر جب صرف پانچ منٹ رہ گئے تو ڈاکٹر فوزی نے طنزیہ لہجے میں کہا:

"تم لوگ ناکام ہوتے نظر آتے ہو انسپکٹر جمشید۔ اور اس کا

مطلب ہے، ہماری فتح ہونے والی ہے، اگرچہ یہ فتح ہم دونوں کی موت پر مکمل ہو گی۔"

"ابھی پورے پانچ منٹ باقی ہیں۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" خان رحمان نے جھلّا کر کہا۔

"جو لوگ چھبیس منٹ میں کچھ نہیں کر سکتے، پانچ منٹ میں کیا کر لیں گے۔ ہمیں تو حیرت پروفیسر داؤد پر ہے۔ سنا ہے، یہ تمھارے ملک کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں، لیکن یہ بھی ابھی تک کچھ نہیں کر سکے۔"

"کوشش تو کر رہے ہیں نا۔ اور یہی انسان کا فرض ہے کہ مرتے دم تک کوشش کیے جائے۔ کوئی یہ تو نہیں کہہ سکے گا کہ ہم نے اپنی جانیں تو بچا لیں، ایٹمی پلانٹ کو نہ بچا سکے۔"

"خیر! یہ میں جانتا ہوں کہ ملک اور قوم کے لیے تم لوگ واقعی مخلص ہو۔" پروفیسر کملان بولا۔

"ابّا جان! یہ لوگ ہمیں باتوں میں لگا کر وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے کوئی بات نہ کریں۔" محمود پریشان ہو کر بولا۔

"اوہ ہاں۔ بات ٹھیک ہے۔"

انھوں نے کہا اور پھر تلاش میں جٹ گئے، ابھی تک انھیں قطعاً کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اور پھر دو منٹ اور گزر گئے۔ اب تین منٹ رہ گئے تھے۔ ان کے جسموں سے پسینہ

بہنے لگا، ایسے میں محمود کی نظر ڈاکٹر فوزی پر پڑی۔ اس کا چہرہ بھی پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ پروفیسر کملان کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ اچانک محمود چونکا:

"وہ مارا۔ میں نے بوجھ لیا۔ ڈائنا میٹ کا کنکشن کہاں ہے۔"

"تت۔ تم نے کیسے بوجھ لیا؟" پروفیسر داؤد حیرت زدہ رہ گئے، آنکھیں پھیل گئیں۔

"پروفیسر کملان کی نظروں کا تعاقب کر کے۔ یہ سامنے لگے نیلے رنگ کے فیوز کو کئی بار چور نظروں سے دیکھ چکے ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ساتھ ہی انھوں نے کملان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی حیرت نظر آئی۔

"جلدی کیجیے پروفیسر صاحب۔ اس فیوز کو دیکھ لیجیے۔"

"نہیں۔ کملان ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"ڈائنا میٹ کا تعلق اس فیوز سے ہو ہی نہیں سکتا۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ کملان کی آنکھوں کی حیرت یک دم بجھ گئی۔

"پروفیسر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ دونوں ہمیں دھوکا دینے

کی کوشش کر رہے ہیں۔ چاہتے ہیں، کسی طرح پلانٹ اُڑ جائے اور بس۔" انسپکٹر جمشید زہریلے لہجے میں بولے۔

"پروفیسر انکل — دو منٹ رہ گئے ہیں۔" فرزانہ نے گویا اعلان کیا۔

"ہاں فرزانہ — یہی بات ہے۔" پروفیسر داؤد سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"تت — تم لوگوں کو موت سے خوف محسوس نہیں ہو رہا۔" ڈاکٹر فوزی بولا۔

"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہاں! اس لمحے میں یہ ضرور کہوں گا — میں خوف محسوس کر رہا ہوں — موت واقعی بہت خوفناک چیز ہے۔"

"اور — اور میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔" کملان کانپتی آواز میں بولا۔

"لیکن خُدا کی قسم — میں خوف محسوس نہیں کر رہا — اپنے دین اور وطن کے لیے جان دینا میرے لیے بہت آسان ہے — میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔"

"ہم بھی آپ کے ہم خیال ہیں ابا جان۔" فارُوق نے جذباتی آواز میں کہا۔

"پروفیسر صاحب — آپ کیوں رُک گئے — کیا ڈائنا میٹ کی تلاش سے مایوس ہو گئے ہیں — اور موت کا خوف آپ پر سوار ہو گیا ہے۔" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"نہ میں مایوس ہُوا ہوں اور نہ تھکا ہوں — موت کا خوف میرے نزدیک نہیں آ سکتا — میں غور کر رہا ہوں — اور غور کرنے

سے بعض اوقات بڑے بڑے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔"

"ہوں! آپ کی بات ٹھیک ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اب صرف ایک منٹ باقی رہ گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ایک منٹ — ہاں واقعی — لیکن ایک منٹ ساٹھ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔" پروفیسر داؤد مسکرائے — وُہ ذرا بھی پریشان دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"کملان — ہمارا وقت آ پہنچا — مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"ڈاکٹر بھوس — ہم اب بھی اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں — ہو سکتا ہے، یہ لوگ ہمیں پھانسی کی سزا نہ دیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایم آئی پی کے کارکن ہمیں ان کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں — ہم پھر ان کی تنصیبات کو اڑانے کا منصوبہ بنا لیں گے — آخر ہم اپنی جان کیوں دیں۔"

"یہ — یہ تم کہہ رہے ہو پروفیسر کملان۔"

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ڈاکٹر بھوس۔"

"نن — نہیں — تمھاری بات میرے دل کو لگی ہے — پروفیسر داؤد — ہم بتانے کے لیے تیار ہیں — عمارت کو تباہ ہونے سے کس طرح بچایا جا سکتا ہے۔"

"لیکن اب وقت گزر چکا ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"کیا کہا — وقت گزر چکا ہے، لیکن ابھی تو پینتالیس سیکنڈ باقی ہیں۔"

"نہیں — اب وقت گزر چکا ہے — تمہیں اس وقت بتانا چاہیے تھا، جب اکتیس منٹ باقی تھے — اب موت کا خوف چھانے پر بتا رہے ہو — یہ ہمیں منظور نہیں۔"

"یہ — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پروفیسر انکل — ان کے بتا دینے سے ہمارا یہ پلانٹ بچ سکتا ہے۔" محمود چلا اُٹھا۔

"میں ان کی بھیک میں دیا ہوا پلانٹ قبول نہیں کروں گا میرے بچو۔" پروفیسر داؤد نے عجیب سی آواز میں کہا۔

انسپکٹر جمشید اور خان رحمان نے حیران ہو کر انہیں دیکھا — پھر جلدی سے گھڑیوں کی طرف دیکھا، صرف تیس سیکنڈ رہ گئے تھے۔

"میں کہتا ہوں — ہم مرنا نہیں چاہتے — عمارت اڑنے سے بچا لو — تیس سیکنڈ بعد اس کے پرخچے اڑ جائیں گے اور اس کے ساتھ ہم بھی سیکڑوں حصّوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔"

"افسوس! تمہیں یہ بات پہلے سوچنی چاہیے تھی۔"

انسپکٹر جمشید، خان رحمان، محمود، فاروق اور فرزانہ کا بُرا حال تھا، وہ بھونچکے سے پروفیسر داؤد کی طرف دیکھ رہے تھے —

"نن — نہیں — نہیں — ہم — ہم مرنا نہیں چاہتے — ہم — ہمیں بچا لو، جس کمرے میں ہماری مُلاقات ہوئی تھی، اس کمرے میں ہی کنکشن لگا ہوا ہے — سرخ اور نیلی تاریں الگ الگ کر دینے سے پلانٹ نہیں اڑے گا — جلدی کرو — جلدی کرو۔"

ڈاکٹر بھوس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی، لیکن پھر ایک جھٹکے سے رک گئے — ان کے سامنے پروفیسر داؤد دیوار بنے کھڑے تھے:

"نہیں جمشید — تم نہیں جاؤ گے۔"

"آپ کو — کیا ہو گیا ہے پروفیسر صاحب؟"

"میں کہہ چکا ہوں جمشید — ہم بھیک میں دیا ہوا پلانٹ قبول نہیں کریں گے۔"

اور اسی وقت تیس سیکنڈ پورے ہو گئے — انھوں نے آنکھیں بند کر لیں — جسموں میں تھرتھری دوڑ گئی —

"موت بھی کیا چیز ہے —" پروفیسر داؤد کی پُرسکون آواز کمرے میں گونج اُٹھی — انھوں نے حیرت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مُسکرا رہے تھے —

آؤ بھئی چلیں

" وقت گزر چکا ، دھماکا نہیں ہوا - اب تم دونوں کیا کہتے ہو۔" پروفیسر داؤد مُسکرائے۔

" تو - تم پہلے ہی ان تاروں کو الگ کر چکے تھے۔" پروفیسر کملان نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

" ہاں ! میں اگر ان لوگوں کے ساتھ نہ ہوتا، تب بھی تم دونوں کی بزدلی اس پلانٹ کو بچالیتی - یہی میں دیکھنا چاہتا تھا ، تم کس حد تک بہادر ہو - افسوس تم میرے معیار پر پورے نہیں اُترے۔"

" وہ مارا - ہم کامیاب ہوگئے۔" فاروق اچھل پڑا - ان کے چہروں پر رونق دوڑ گئی -

" جاؤ محمود - پرویز بخاری اور دوسروں کو بلا لاؤ - ابھی ڈائنامیٹ یہاں سے ہٹانے بھی ہیں - اور ان لوگوں سے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ ہمارے ڈاکٹر فوزی اور پروفیسر ڈار کہاں ہیں۔"

" ہمیں نہیں معلوم - وہ کہاں ہیں - ایم آئی پی کا باس بتا

سکتا ہے۔"

" لیکن ہم باس کو کہاں تلاش کرتے پھریں - اس لیے تم ہی بتا دو۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

" ایم آئی پی کا ایک اصول یہ ہے کہ ہر آدمی اپنا اپنا کام کرتا ہے - اس لیے ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اور وہ کہاں ہیں۔"

" خیر - ہم معلوم کر لیں گے - تم فکر نہ کرو۔"

جلد ہی پرویز بخاری اور ملٹری وہاں پھر پہنچ گئی - پروفیسر داؤد کی مدد سے ڈائنامیٹ ہٹا لیے گئے - دونوں مجرموں کو ملٹری کی حفاظت میں شہر روانہ کر دیا گیا اور پھر وہ بھی وہاں ملے رخصت ہوئے ، تین گھنٹے کے بعد شہر پہنچے —

" اب ہم ڈاکٹر فوزی اور پروفیسر ڈار کے لیے کیا کریں۔" محمود بولا —

" ابھی معلوم ہو جاتا ہے - فکر نہ کرو - جاتے ہوئے میں اکرام اور چند اور ماتحتوں کی کچھ ڈیوٹی لگا گیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ فون پر جٹ گئے - آخر ان کی طرف آتے ہوئے بولے :

" آؤ بھئی - چلیں۔"

" کیا کچھ معادم ہوا۔"

" نہیں ! اکرام کامیاب نہیں ہو سکا۔"

"تب پھر - ہم کہاں جا رہے ہیں - گھر۔"

"گھر کس طرح جا سکتے ہیں - جب تک کہ ڈاکٹر فوزی اور پروفیسر ڈار کو ان کے گھروں تک نہ پہنچا دیں۔" انسپکٹر جمشید بولے —

اور جیپ چل پڑی - آخر ایک عمارت کے سامنے رُکی :

"ہم لوگ دستک دیے بغیر اندر داخل ہوں گے ، اگر دروازے بند ہوں گے تو پائپ وغیرہ کے ذریعے اندر داخل ہوں گے۔"

"جی بہتر - آپ فکر نہ کریں - فارُوق ہمارے ساتھ ہے۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں ! کیوں نہیں - فکر نہ کرو۔" فارُوق بھی مسکرا دیا۔

"واقعی - جب یہ پائپوں پر چڑھتا ہے - تو بندروں کی یاد بھلا دیتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"آپ سُن رہے ہیں انکل - یہ مجھے بندر کہہ رہی ہے ۔" فارُوق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہاں ، سُن رہا ہوں۔" خان رحمان بولے اور فارُوق کا منہ اور بن گیا۔

انہیں پائپ کا سہارا ہی لینا پڑا - فاروق نے چھت پر پہنچنے میں صرف دو منٹ لگائے اور پھر صدر دروازہ کھول دیا - وُہ اندر داخل ہوئے - اور دبے پاؤں آگے بڑھے - ایک کمرے

میں روشنی ہو رہی تھی اور اندر سے باتیں کرنے کی آواز بھی سُنائی دے رہی تھی - کوئی کہہ رہا تھا :

"اس وقت تک پلانٹ تباہ ہو چکا ہو گا - ڈاکٹر جھوسں اور پروفیسر کملان یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے - بلکہ اب تک تو انھیں پہنچ جانا چاہیے تھا - شاید راستے میں کوئی رکاوٹ پیش آ گئی ہو - بہرحال وُہ آتے ہی ہوں گے - مسٹر شارگون تم ان کے ساتھ ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤ - اب تمھارا بھی یہاں رہنا خطرناک ہو گا ، کیونکہ تم انسپکٹر جمشید کی نظروں میں آ چکے ہو۔"

"او کے باس - جو آپ حکم فرمائیں۔" انھوں نے شارگون کی آواز سُنی —

"میں بدستور یہاں اپنے فرائض انجام دیتا رہوں گا - مجھ پر ابھی تک انسپکٹر جمشید کو شک نہیں ہو سکا۔" باس کی آواز اُبھری۔

اسی وقت انسپکٹر جمشید نے دروازے پر ایک ٹھوکر رسید کی - دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے اور انسپکٹر جمشید کی آواز گونج اُٹھی :

"یہ غلط ہے - میں تو تمھیں بہت پہلے پہچان چکا تھا۔"

کمرے میں موجود سب لوگ اچھل کر کھڑے ہو گئے - ان میں ایک نقاب پوش ، بھی تھا - ساتھ ہی ان کے ہاتھ اپنی اپنی

…یوں کی طرف بڑھے :

"نہیں نہیں — اس کی ضرورت نہیں — میرے ہاتھ میں پہلے ہی پستول موجود ہے — اور تم لوگ میرے نشانے سے بھی واقف ہو، لہذا ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

کمرے میں نقاب پوش اور شارگون کے علاوہ آٹھ آدمی اور تھے — اور یہ ایم آئی پی کے کارکن تھے — ان کے ہاتھ مشینی انداز میں اُٹھتے چلے گئے — چہروں پر خوف دوڑ گیا — انسپکٹر جمشید نے آگے بڑھ کر نقاب نوچ لیا — ان کے سامنے اُستاد طوطے خان آنکھیں جھپک رہا تھا —

"اُف خدا — ہمیں شارگون کے ساتھ پہلی جھڑپ یاد آ رہی ہے — شارگون کو بچانے کی پوری پوری کوشش کی تھی اس نے۔" محمود نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ! اور کاروں کا رجسٹر بھی پیش نہیں کیا تھا — اسی نے خابو کو قتل کیا، پھر ہسپتال میں راضی کو ہلاک کیا — اس پورے منصوبے کا انچارج یہی تھا — پھر یہ ہمارے ساتھ پھنس گیا اور خود اس کے آدمی بھی نہیں جانتے تھے کہ وُہ اپنے باس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

سب لوگ کمرے میں ساکت کھڑے ان کی گفتگو سن رہے تھے — اچانک ایک فائر ہوا — اور یہ فائر کمرے کے روشندان

میں سے ہوا تھا — پستول انسپکٹر جمشید کے ہاتھ سے نکل گیا — ہاتھ کی اُنگلیوں سے خُون نکلتا نظر آیا :

"بہت خوب ٹوڈی — اسی لیے میں نے تمھاری ڈیوٹی روشندان پر لگائی تھی — یہ کام دکھایا ہے تم نے۔" استاد طوطے خان نے چہک کر کہا — شارگون بلا کی رفتار سے پستول کھینچ کر چکا تھا اور اب اس کی نالی کا رُخ ان کی طرف کیے کھڑا تھا۔

وہ دھک سے رہ گئے — جیتی جتائی بازی کھٹائی میں پڑ گئی تھی —

"تم یہاں بھی ہار گئے، انسپکٹر جمشید اور ادھر تمھارا ایٹمی پلانٹ بھی غارت ہو گیا۔" وُہ چہک کر بولا۔

"تم بہت بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو — ہم ایٹمی پلانٹ سے ہی چلے آ رہے ہیں — اللہ کی مہربانی سے ہم اسے بچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں — ڈاکٹر جوس اور پروفیسر کملان گرفتار ہو چکے ہیں — اور اب تمھاری باری ہے۔"

"میری باری — شاید تمھارا دماغ چل گیا ہے — باری تو اب تم لوگوں کی ختم ہونے کی ہے — شارگون دیکھ کیا رہے ہو — بھون ڈالو انھیں —"

ابھی یہ الفاظ پورے ہوئے ہی تھے کہ باہر ایک فائر ہوا، اور کسی کے دھم سے گرنے کی آواز سنائی دی — شارگون نے بوکھلا

کر روشندان کی طرف جو دیکھا تو انسپکٹر جمشید نے اس پر چھلانگ
لگا دی۔ اسے زبردست دھکا لگا اور پستول اس کے ہاتھ سے
بھی نکل گیا۔ اس پر قبضہ کرنے کے لیے محمود نے چھلانگ لگائی۔
ساتھ ہی شارگون کے قریب کھڑے ایک ساتھی نے چھلانگ لگائی۔
دونوں اس زور سے ٹکرائے کہ مخالف سمتوں میں گرے اور سر پکڑ
کر بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر فاروق حرکت میں آیا۔ لیکن اس سے
پہلے ایک دشمن پستول کی طرف بڑھ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر فاروق
نے پستول کو ایک ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ فرزانہ کے قدموں
میں آ رہا۔

ادھر باس نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی، لیکن انسپکٹر
جمشید نے ٹانگ آگے کر دی۔ وہ منہ کے بل گرا، لیکن بلا کی
سرعت سے اٹھا اور ایک دوہتڑ انسپکٹر جمشید کے منہ پر دے
مارا، وہ تیزی سے جھک گئے اور دوہتڑ شارگون کے منہ پر لگا،
کیونکہ ادھر سے اس نے بھی دروازے کا رُخ کیا تھا۔

اتنے میں خان رحمان آگے بڑھ چکے تھے۔ انھوں نے
شارگون کی ناک پر ایک مکا رسید کیا۔ وہ زور سے لڑکھڑایا۔
ادھر انسپکٹر جمشید نے باس کے مکے سے بچنے کی کوشش میں
دایاں پاؤں اُچھال دیا، ان کا پیر باس کے ہاتھ سے ٹکرایا اور
باس بھنا اٹھا۔ اس نے تلملا کر ان پر چھلانگ لگائی۔ اور

انھیں ساتھ لیتے ہوئے فرش پر گرا۔ انسپکٹر جمشید نے ایک پلٹنی
کھائی اور اسے اُچھال پھینکا۔

دوسری طرف فرزانہ کے دونوں ہاتھ پستول پر جمے ہوئے
تھے اور باس کا ایک ساتھی اس سے پستول چھیننے کی بھرپور کوشش
کر رہا تھا:

"مشکل ہے بھئی۔ بہت مشکل۔ تم اس پستول کو میرے ہاتھ
سے نہیں نکال سکو گے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ میرے ہاتھ کلائی کا
ساتھ چھوڑ دیں۔"

اس وقت محمود تین آدمیوں کے درمیان گھرا ہوا تھا اور
فاروق پر دو آدمی جھپٹے پڑ رہے تھے۔ خان رحمان بھی دو
آدمیوں سے جنگ کر رہے تھے۔ کمرہ اچھا بھلا میدانِ جنگ بنا
ہوا تھا۔ انھیں حیرت اس بات پر تھی کہ روشندان والے آدمی
پر فائر کس نے کیا تھا اور ابھی تک وہ سامنے کیوں نہیں آ
سکا تھا۔

باس نے فرش پر گرنے کے بعد اٹھنے میں صرف ایک سیکنڈ
لگایا اور پھر ان پر آیا۔ اس بار انھوں نے اسے اپنے گھٹنوں پر
رکھا، لیکن وہ جھکائی دے گیا۔ اور ان کی بائیں پسلیوں پر ایک
لات دے ماری، انھوں نے فرش پر گر کر خود کو اس وار سے
بچایا۔ اور اس کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ اب وہ ان کی

گرفت میں بُری طرح مچل رہا تھا۔

ادھر فرزانہ ابھی تک پستول سے چمٹی ہوئی تھی اور دشمن پستول اس سے چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکا — خان رحمان پورے زور شور سے دونوں ہاتھوں کے مکّے استعمال کر رہے تھے۔ محمود اپنے مقابلے پر تینوں دشمنوں کو تگنی کا ناچ نچائے دے رہا تھا — فاروق دونوں دشمنوں کے مقابلے پر بخوبی ڈٹا ہوا تھا — ایک بار جو وہ دونوں دو مختلف سمتوں سے اس پر جھپٹے تو وہ یک دم نیچے بیٹھ گیا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں پوری قوت سے ٹکرائے —

"ارے — یہ کیا چیز آپس میں ٹکرائی؟" فرزانہ حیرت زدہ لہجے میں بولی —

"تم پستول سے چمٹی رہو — اور ٹکرانے وکرانے کی فکر نہ کرو۔" محمود نے فوراً کہا۔

"اچھا — تم بھی پستول کی فکر نہ کرو — اس کے فرشتے بھی پستول مجھ سے نہیں چھین سکتے۔"

"بے چارے فرشتے۔" فاروق بولا۔

"لیکن بھئی — باہر فائر کس نے کیا تھا؟" محمود حیران ہو کر بولا۔

"شاید ہم میں سے کسی کے فرشتے نے کیا ہوگا۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"ابا جان — کیا آپ آتے ہوئے انکل اکرام کو یہاں پہنچنے کے لیے فون کر آئے تھے؟"

"ہاں — یہی بات ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"تب پھر — اگر روشندان والے دشمن پر فائر انھوں نے کیا تھا تو اب تک وہ اندر کیوں داخل نہیں ہوئے۔"

"یہ تو اکرام ہی بتائے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔"

پورے کمرے میں صرف پروفیسر داؤد ایسے تھے جو ایک کونے میں سمٹے ہوئے تھے اور ابھی تک انھوں نے اس لڑائی میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا — ایسے میں محمود کی ایک لات ایک دشمن کے پیٹ میں جو لگی تو وہ پروفیسر صاحب کے پیروں کے پاس گرا — اسے اور تو کچھ نہ سوجھا — ان کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ لیں — وہ گھٹتے گھٹتے فرش پر گرے —

"یہ — یہ تم کیا کر رہے ہو؟" وہ گھبرا کر بولے۔

ان کی آواز فاروق نے سن لی — ایک نظر ان پر ڈالی — اور پھر اچانک دونوں دشمنوں کے درمیان سے نکل کر ان کی طرف آیا — پاؤں کی ایک زور دار ٹھوکر اس دشمن کے رسید کی — جس نے پروفیسر صاحب کی ٹانگیں ابھی تک پکڑ رکھی تھیں — اور پھر اپنے دونوں دشمنوں کی طرف مڑا — وہ اس کے عین سر پر پہنچ

چکے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے جھکائی دی اور دُوسری طرف نکل گیا۔

عین اسی وقت فرزانہ نے اپنے مقابل کو اُچھال پھینکا اور چلّا اٹھی:

" خبردار — گولی مار دوں گی۔ لڑائی بھڑائی بند کر دو اور ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ لڑنا بھڑنا یوں بھی بُری بات ہے ۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے ایک ہوائی فائر کر دیا۔

" اور ابھی خود تم کیا کر رہی تھیں ۔" فاروق نے جل کر کہا۔

" میں — میں تو بس ذرا پستول چھین رہی تھی ۔" اس نے مُسکرا کر جواب دیا۔

" دھت تیرے کی — تم ان حالات میں بھی باز نہیں آتے۔"

" باز آئیں ہمارے دشمن ۔" فاروق چہکا۔

فرزانہ کے ہوائی فائر نے دشمنوں کو گڑبڑا دیا — وہ بڑبڑا کر اِدھر اُدھر ہو گئے اور پھر ان کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے ۔

اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی :

" لیجیے ابّا جان — انکل اکرام بھی اسی انتظار میں تھے کہ کب ہم حالات پر قابو پائیں اور کب وہ آئیں ۔" فاروق مسکرایا۔

" ہاں ! اکرام نے دیر کر دی ، لیکن اس کی کوئی وجہ ضرور ہو گی ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

آخر اکرام اور اس کے ماتحت اندر داخل ہوئے ۔

" کیوں بھئی — اتنی دیر کہاں لگا دی ؟"

" بس سر — کیا بتاؤں — راستے میں جیپ کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔"

" تو دوسری جیپ پر آ گئے ہوتے — تم سب لوگ ایک جیپ پر تو آ نہیں رہے تھے ۔"

" باقی جیپوں کے ٹائر بھی پنکچر ہو گئے تھے ۔"

" ارے — وہ کیسے ؟"

" درختوں کے پیچھے سے فائرنگ کی گئی تھی — اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم ان کے پیچھے جاتے یا ٹائر تبدیل کرتے — بس ہم جیپوں سے اُتر پڑے اور اس طرف دوڑ لگا دی ۔"

" حیرت ہے ، پھر وہ فائر کس نے کیا تھا ؟"

" جی — کون سا فائر ۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

" کیا تم نے اپنی روانگی سے پہلے کسی اور کو اس طرف روانہ کیا تھا ؟"

" جی ہاں ! آپ کا فون ملتے ہی میں نے حوالدار محمد حسین آزاد کو موٹر سائیکل پر روانہ کر دیا تھا ۔"

" اوہ ! تب پھر فائر اسی نے کیا تھا ، لیکن حیرت ہے — وہ کہاں گیا ۔"

" اس نے فائر کہاں کیا تھا ؟" اکرام حیران ہو کر بولا ۔

"روشندان میں انھوں نے ایک آدمی کو بٹھا رکھا تھا — اس نے میرے پستول پر فائر کر کے کام خراب کر دیا، لیکن پھر اس پر کسی نے فائر کیا۔"

"اوہ — میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکرام کمرے سے نکل گیا اور پھر محمد حسین آزاد کو سہارا دیتے ہوئے کمرے میں لے آیا — وہ ہنس رہا تھا۔

"کیا ہوا اکرام؟"

"انھوں نے روشندان کے عین نیچے کھڑے ہو کر اس پر فائر کیا تھا — نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان پر ہی گرا اور یہ بے ہوش ہو گئے۔"

اور ان کی کھی کھی شروع ہو گئی — اکرام کے ماتحت مجرموں کو جلدی جلدی ہتھکڑیاں پہنانے میں مصروف تھے۔

"اور آپ کہاں غائب ہو گئے تھے سر؟"

"آئی جی صاحبان کو فون کرو اکرام — بہت اہم معاملہ ہے۔" انسپکٹر جمشید نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔

"جی بہتر!"

جلد ہی وہاں تمام بڑے بڑے آفیسر پہنچ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے پوری تفصیل سنا دی — ان کی حیرت کا کیا پوچھنا — اس سے پہلے تک تو صرف یہ بات سننے میں ہی آتی رہی تھی کہ ایم آئی پی

ان کے ملک کے ایٹمی پلانٹ کو اڑا دینے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہے، لیکن اب تو عملی طور پر یہ بات ثابت ہو چکی تھی۔

اس عمارت میں فارغ ہونے میں انھیں بہت دیر لگ گئی، اس دوران فون کی گھنٹی بجی — انسپکٹر جمشید نے ریسیور اٹھایا تو صدر صاحب کی آواز سنائی دی — انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش رہنے کے لیے کہا تو محمود، فاروق اور فرزانہ اپنے کان قریب لے آئے۔

"یس سر۔" انسپکٹر جمشید کہہ رہے تھے۔

"مبارک ہو جمشید۔"

"شکریہ سر — لیکن اس مبارک باد کے موقعے پر میں ایک درخواست کروں گا سر۔" انسپکٹر جمشید عجیب سے لہجے سے بولے۔

"ہاں ہاں کہو۔"

"مجھے اجازت دیں کہ میں بھی بیگال کی ایٹمی تنصیبات اڑانے کا منصوبہ ترتیب دوں اور پھر وہاں جا کر اس منصوبے کو عملی جامہ پہناؤں۔"

"کیا واقعی جمشید؟" صدر صاحب پرجوش لہجے میں بولے۔

"یس سر — یہ میری شدید خواہش ہے۔"

"تب پھر میری طرف سے اجازت ہے — حکومتِ بیگال نے مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔"

"شکریہ - اب آپ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"اچھی بات ہے - میں ان کی تنصیبات کے اڑنے کی خبر سننے کے لیے بے چین رہوں گا۔"

"انشاء اللہ بہت جلد آپ یہ خبر سُن لیں گے۔" انھوں نے کہا اور خدا حافظ کہتے ہوئے صدر صاحب نے ریسیور رکھ دیا۔

"آپ کو کس طرح اندازہ ہوا تھا ابّا جان کہ مجرم طوطے خان ہے؟" محمود نے اُلجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"جب ہم ہسپتال پہنچے تو وہ راضی والے کمرے میں موجود تھا - اور راضی مر چکا تھا، اس کی جیب سے کارڈ بھی برآمد نہیں ہوا، پھر وہ ہمیں خابو کے فلیٹ میں لے گیا، خابو بھی پہلے ہی ہلاک کیا جا چکا تھا - اور اس کی جیب میں بھی کارڈ نہیں تھا - دوسرے اس نے بتایا تھا کہ راضی کے زخمی ہونے کے بارے میں اسے ایک گمنام فون ملا تھا، حالانکہ ایم آئی پی کے کارکنوں کو قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی اسے فون کرنے کی - جب کہ اسے ختم کرنا مقصود تھا، پھر اس کے دفتر سے ڈرائیوروں کا رجسٹر بھی نہیں ملا - حالانکہ دفتر کی کسی نے تلاشی بھی نہیں لی تھی - اگر تلاشی کے آثار ہوتے تو یہ خیال کیا جاتا کہ کسی نے رجسٹر تلاش کرنے کے لیے ایسا کیا ہے، لیکن طوطے خان کو تو معلوم ہی تھا کہ رجسٹر کہاں ہے، اس لیے تلاشی لینے کی ضرورت نہیں تھی - یہ بھی اس کی غلطی تھی کہ تلاشی کے آثار پیدا نہیں کیے، حالانکہ دفتر میں شارگون موجود ملا تھا تم لوگوں کو اور اس سے تمھاری جھڑپ بھی ہوئی تھی - پھر شارگون نے دفتر کی تلاشی کیوں نہیں لی - یہ سب باتیں مجھے شروع سے ہی کھٹک رہی تھیں، پھر جتنا عرصہ وہ ہمارے ساتھ رہا، باس کا ان مجرموں سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا - اس بارے میں بھی میں برابر غور کرتا رہا۔"

"ہوں! اور لائٹر کے ساتھ ماچس کی کیا ٹیکنیک ہے؟"

"پروفیسر صاحب ان لائٹروں کا معائنہ کر چکے ہیں، دراصل قریب کے فاصلے پر موجود ایم آئی پی کے کارکن ایک دوسرے کی مدد ان لائٹروں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں - وہ لائٹر نہیں، رابطہ قائم کرنے کا آلہ ہیں۔" انھوں نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے - شارگون کو بھی باس کے بارے میں معلوم نہیں تھا؟"

"بالکل نہیں - کوئین برج سے شارگون کو رہا بھی اس وقت کرایا گیا جب ہم اُستاد طوطے خان سے الگ ہو گئے تھے، گویا اس نے ہم سے الگ ہوتے ہی کارکنوں کو شارگون کے بارے میں اطلاع دے ڈالی تھی -"

"اوہ ہاں! بالکل یہی بات ہے۔" محمود پُرجوش لہجے میں بولا۔

"ابّا جان - اصلی ڈاکٹر فوزی اور پروفیسر ڈار تو رہ ہی گئے۔"

"فکر نہ کرو، تمھارے انکل اکرام انھیں یہیں سے برآمد کر دکھائیں

گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

اور اکرام ماتحتوں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ عمارت کے آخری حصے کے ایک کمرے سے آخر ان دونوں صاحبان کو برآمد کر لیا گیا۔ گویا باس کا مرکز مال روڈ کے آخری سرے کی زمین پر بنی یہی عمارت تھی۔ وائرلیس نما آلہ بھی ایک الماری میں مل گیا۔

دوسرے دن کے اخبارات نے ملک بھر میں ہل چل مچا دی۔ انھیں مبارک باد کے فون پر فون آنے لگے۔ اس قدر فون آئے کہ فاروق پریشان ہو کر پکار اٹھا:

"اُف اللہ! اس قدر مبارک بادوں کو ہم کہاں سنبھال کر رکھیں گے۔ پہلے تو جگہ کا انتظام ہونا چاہیے تھا۔"

"تمھارے دماغ میں پہلے ہی کیا رکھا ہے۔ اسی میں جمع کر لو۔" فرزانہ نے ہنس کر کہا۔

"واہ۔ کتنی شاندار ترکیب بتائی۔" محمود چہک کر بولا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر تم دونوں بھی اپنے دماغ خالی کر لو، کیونکہ مجھے تو یہ سلسلہ ابھی رکتا نظر آتا نہیں۔"

ابھی اس کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ فون پھر گنگنانے لگا۔

2000 روپے کے نقد انعامات

"پُرخوف فتنہ" کا انعامی سوال
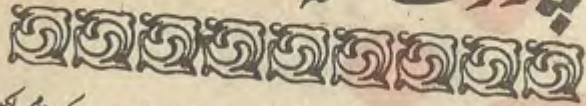
س: صہ ۸۳ پر انسپکٹر جمشید نے کسے فون کیا تھا؟ جواب میں صرف ایک نام لکھیے۔

انعام کی تفصیل
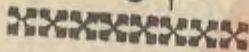
1. موصول ہونے والے پہلے درست جواب پر ۱۰۰۰ روپے کا نقد انعام
2. موصول ہونے والے دوسرے درست جواب پر ۵۰۰ روپے کا نقد انعام
3. ان کے بعد موصول ہونے والے دس درست جوابات پر ۵۰، ۵۰ روپے کا نقد انعام

نوٹ

اپنا جواب ہر خاص نمبر کا الگ الگ کاغذ پر درج کریں۔ کاغذ کے اوپر خاص نمبر کا نام، نیچے جواب اور اس کے نیچے اپنا نام پتا لکھیں۔ کم از کم کاپی سائز کا کاغذ استعمال کریں۔

(ادارہ)